احیاءِ اسلام
مولانا وحید الدّین خاں

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

دیباچہ

وسط افریقہ میں نیروبی کے پاس ایک پہاڑی مقام ہے جس کا نام کیگالی (Kigali) ہے۔ یہاں قدرتی مناظر کے خوبصورت ماحول میں ایک جدید اسلامی مرکز قائم کیا گیا ہے جس کا فرانسیسی نام (Le Centre Culturel Islamique) ہے۔ اس مرکز میں تعلیم یافتہ عرب نوجوانوں کا ایک اجتماع دسمبر ۱۹۸۱ میں ہوا جس میں راقم الحروف کو دعوت دین اور احیاء اسلام کے موضوع پر لکچر دینے کے لئے بلایا گیا۔ اس موقع پر پیش کرنے کے لئے چند لکچر ترتیب دئے گئے تھے۔ تاہم بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر میں اس میں شریک نہ ہوسکا۔ اب یہ مجموعہ زیر نظر کتاب کی صورت میں شائع کیا جارہا ہے۔ موجودہ کتاب ان لکچروں کا اردو ایڈیشن ہے۔ ان کا عربی ایڈیشن علیحدہ کتاب کی صورت میں شائع ہوگا۔

ان خطبات میں مختلف پہلوؤں سے جس بات پر زور دیا گیا ہے وہ یہ کہ اسلام کے احیاء کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ گہرا فکر اور دوررس منصوبہ بندی ہے۔ سطحی خوش فہمیوں اور وقتی کارروائیوں سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام (۱۹۸۵-۲۱۶۰ ق م) نے اپنی اولاد کو حجاز میں بسایا اور کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے یہ دعا کی کہ خدایا، تو ان کے اندر ایک پیغمبر بھیج جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ یقیناً تو عزیز وحکیم ہے (البقرہ ۱۲۹)

حضرت ابراہیم کی یہ دعا پوری طرح قبول ہوگئی۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، نبی عربی کا ظہور اس دعا کے ڈھائی ہزار سال بعد چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کا یہ طریقہ نہیں کہ اچانک واقعات کو ظاہر کردے۔ خدا اپنے فیصلہ کو حالات کے درمیان ظاہر کرتا ہے نہ کہ طلسمات کے درمیان۔ حضرت ابراہیم کی دعا کی قبولیت کے باوجود نبی عربی کا ظہور اس وقت ہوا جب کہ حالات اپنی فطری رفتار سے چل کر وہاں پہنچ چکے تھے جہاں پہنچنے کے بعد وہ وقت آگیا تھا کہ اب آخری رسول کو دنیا میں بھیج دیا جائے۔

اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے ربانی حکمت درکار ہے۔ اس کے لئے اس یقین کی ضرورت ہے کہ مستقبل میں چھپی ہوئی فصل کی خاطر ہم اپنے دانہ کو زمین میں دفن کرسکیں۔ اس کے لئے اس صبر کی ضرورت ہے کہ چنار کے پودے کو درخت کی صورت میں دیکھنے کے لئے ہم سو سال کا انتظار کرسکیں۔ اس کے لئے وہ بلند نظری درکار ہے کہ پھول کی طرح ہم دوست دشمن سب کے لئے مہکیں اور

سورج کی طرح ہر پست و بلند کے لئے چمکیں۔ پیغمبر کی دعا جب حقائق کی پوری رعایت کرتے ہوئے اپنی تکمیل کو پہنچی تو ہماری کوئی جدوجہد حقائق کی رعایت کے بغیر کس طرح واقعہ کی صورت اختیار کر سکتی ہے۔

کسی نظام زندگی کا غلبہ ہمیشہ نظامِ فکر میں غلبہ کے بعد ہوتا ہے۔ جمہوری نظام جدید دنیا میں اس وقت رائج ہو سکا جب کہ طویل نظریاتی جدوجہد کے بعد بادشاہی طرز فکر پر جمہوری طرز فکر کو عمومی غلبہ حاصل ہو گیا۔ اسی طرح اشتراکی نظام اس وقت قائم ہوا جبکہ اعلیٰ ترین دماغوں کی مسلسل کوشش نے اجتماعی ملکیت کے تصور کو انفرادی ملکیت کے تصور پر نظری فتح دے دی۔ اسلام کا احیا ربھی آج کی دنیا میں اسی طرح ہوگا۔

قدیم زمانہ میں شرک کے نظام کو غلبہ حاصل تھا۔ رسول اور آپ کے اصحاب نے بے پناہ دعوتی کوشش سے موحدانہ طرز فکر کو مشرکانہ طرز فکر پر غالب کیا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ توحید کی بنیاد پر زندگی کا عملی نظام بنایا جا سکے۔ دور اول میں جو انقلاب آیا تھا اس کے اثرات تقریبًا ایک ہزار سال تک جاری رہے۔ اس کے بعد حالات بدلنا شروع ہوئے۔ اب موجودہ زمانہ میں یہ تبدیلی اس انتہا کو پہنچی ہے کہ قدیم شرک کی جگہ جدید ہیومنزم نے لے لی ہے۔ آج کی دنیا میں ہر طرف انسان پرستی کا غلبہ ہے۔ جو معاملہ پہلے توحید بمقابلہ شرک تھا، وہ اب خدا پرستی بمقابلہ انسان پرستی ہو گیا ہے۔ اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے پہلے ہمیں فکری انقلاب لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ کوئی حقیقی عملی انقلاب وجود میں آسکے۔

جس طرح قدیم زمانہ میں ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں خدا نے شرک کے مقابلہ میں توحید کو غالب کرنے کے حالات فراہم کئے تھے، اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں توحید کے مقابلہ میں انسان پرستی کو زیر کرنے کے لئے بھی بہترین موافق حالات جمع کر دئے گئے ہیں۔ تاہم ان کو استعمال کرنے کے لئے صبر اور ہوش مندی کی ضرورت ہے۔ ہمارے اسلاف نے پچھلے مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کر کے دور اول میں توحید کو غالب کیا تھا۔ اسی طرح اب دور ثانی میں بھی جدید پیدا شدہ مواقع کو صبر اور ہوش مندی کے ساتھ استعمال کر کے ہی اسلام کو دوبارہ غالب اور سربلند کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام نہ طلسماتی خوش فہمیوں سے ہوگا اور نہ پرجوش ہنگامہ آرائیوں سے۔ اسلام کے غلبۂ اول کی تاریخ اس کے غلبۂ ثانی کے طریقہ کو بتانے کے لئے بالکل کافی ہے۔

وحید الدین
۸ رمئی ۱۹۸۲

معرفت کی دو سطحیں

زمین و آسمان کا نظام انتہائی حیرت انگیز نظام ہے۔ سائنس داں اس پر غور کرتا ہے۔ مگر سائنسداں کائنات کے مطالعہ سے کیا پاتا ہے۔ سائنس داں کے لئے کائنات بس حسابات اور اعداد و شمار کی ایک چیز ہوتی ہے ـــــــ زمین کا قطر ۲۵ ہزار میل ہے۔ سورج زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتی ہے، وغیرہ ۔ سائنس داں کو کائنات کے مطالعہ سے بس اس قسم کی کچھ شماریاتی تفصیلات حاصل ہوتی ہیں ۔

مگر اسی کائنات کو جب ایک مومن دیکھتا ہے تو وہ اس کے لئے حقیقت اعلیٰ سے ملاقات کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں، وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تونے یہ سب بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، تونے جسے آگ میں ڈالا اس کو تونے بڑی رسوائی میں ڈال دیا۔ اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں، اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکارتا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے۔ اے ہمارے رب، پس تو ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ اے ہمارے رب، تونے جو وعدے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہم کو رسوائی میں نہ ڈال۔ بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے ـــــ (آل عمران رکوع آخر)

سائنس داں نے بھی کائنات کو دیکھا اور مومن نے بھی اسی کائنات کو دیکھا۔ مگر سائنس داں کائنات کو سائنسی نظر سے دیکھتا ہے اور مومن کائنات کو ایمانی نظر سے۔ نظر کا یہ فرق دونوں کے مشاہدہ کے حاصل میں غیر معمولی فرق پیدا کر دیتا ہے۔ سائنسی نظر سے کائنات کو دیکھنے والے کو صرف شماریات کی قسم کی کچھ ظاہری چیزیں ملی تھیں۔ مگر جس نے کائنات کو ایمانی نظر سے دیکھا اس کے لئے کائنات خدائی جلووں کا معنوی خزانہ بن گئی۔ اس کو یہاں ایک خدائی اسکیم نظر آئی۔ اس نے کائنات کے پردے میں جنت اور جہنم کو دیکھ لیا۔ اس میں اس کو اعتراف حق کی غذائیں ملنے لگیں۔ اس میں اس نے کائنات کے بامقصد ہونے کا راز دریافت کر لیا۔ وہ اس کے ذریعہ سے خالق کے عین قریب پہنچ گیا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ معرفت کی دو سطحیں ہیں۔ ایک ظاہری سطح اور دوسری باطنی اور گہری سطح۔ یہی بات ہر چیز کے بارے میں ہے اور یہی بات قرآن کے بارے میں بھی ہے۔ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قرآن سات حرفوں پر اترا ہے۔ اس کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اور ہر حد کے لئے ایک مطلع ہے (عن ابن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما اُنزِلَ القرآنُ علیٰ سبعۃِ احرفٍ لکلِّ آیۃٍ منھا ظھرٌ وبطنٌ ولکلِّ حدٍّ مُطَّلَعٌ، شرح السنۃ)

مُطَّلَع عربی زبان میں جھانکنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اگر آپ عام جگہ پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو صرف قریب کی چیزیں دکھائی دیں گی۔ اور اگر آپ زیادہ بلندی پر کھڑے ہوں تو بہت دور تک کی چیزیں آپ کو نظر آنے لگیں گی۔ اسی طرح قرآن سے استفادہ کے بھی دو مطلع (مقام مشاہدہ) ہیں۔ اس اعتبار سے قرآن کو سمجھنے کی دو سطحیں بن جاتی ہیں۔ قرآن کا ایک ظاہری مفہوم ہے جو سادہ طور پر اس کو پڑھنے سے سمجھ میں آتا ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن کا ایک گہرا مفہوم ہے جو غور و فکر کے ذریعہ واضح ہوتا ہے۔ ظاہری مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ اس کے ظاہری الفاظ پر ٹھہر جائیں۔ الفاظ قرآن سے بظاہر جو مفہوم نکل رہا ہے اس سے آگے جانے کی کوشش نہ کریں۔ باطنی مطلع سے قرآن کو سمجھنا یہ ہے کہ آپ الفاظ کے گہرے معانی تک پہنچنے کی کوشش کریں، سطروں کے ساتھ بین السطور میں چھپے ہوئے معانی پر بھی غور کریں۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ہم دو مثالیں نقل کریں گے۔

۱۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو۔ اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں۔ اس میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں۔ پھر وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی کمزور ہوں۔ اس وقت باغ پر تیز گرم بگولا آئے اور باغ جھلس جائے۔ اللہ اس طرح اپنی نشانیاں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو (بقرہ ۲۶۶)

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنی مجلس میں یہ آیت پڑھی اور کہا کہ اس آیت نے آج کی رات مجھے سونے نہیں دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ تمھارا کیا خیال ہے کہ کس کے بارہ میں یہ آیت اتری ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ کی مثال دی گئی ہے اور یہ یاد دلایا گیا ہے کہ یہ چیزیں خدا کی نعمتیں ہیں۔ خدا جب چاہے ان کو دے اور جب چاہے گرم ہوائیں بھیج کر انھیں جلا دے۔ گویا ان لوگوں کے نزدیک اس آیت کا مطلب بس وہی تھا جو بظاہر اس کے الفاظ سے نکل رہا تھا۔

آخر میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بولے جو اس وقت نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ اس میں انسانی عمل کی تمثیل ہے۔ حضرت عمر نے پوچھا کہ کون سا عمل۔ انھوں نے کہا: یہ ایسے آدمی کی مثال ہے جو مال دار ہے۔ وہ اللہ کی

اطاعت کر رہا ہے۔ پھر اللہ نے اس کی آزمائش کے لئے اس کے پاس شیطان کو بھیجا۔ اس سے متاثر ہوکر وہ آدمی گناہ کا کام کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کے اعمال ختم ہوگئے۔ حضرت عمر نے فرمایا: میرے بھتیجے تونے سچ کہا۔ اس کے بعد حضرت عمر نے ان الفاظ میں آیت کی تشریح کی:

عُنی بہا العمل۔ ابن آدم افقر ما یکون الی جنتہ اذا کبر سنہ وکثرت عیالہ وابن آدم افقر ما یکون الیٰ عملہ یوم القیامۃ (تفسیر ابن کثیر)

اس مثال سے عمل مراد لیا گیا ہے۔ انسان اپنے باغ کا اس وقت زیادہ محتاج ہوتا ہے جب کہ اس کی عمر بڑھے اور اولاد زیادہ ہو جائے۔ اور انسان اپنے عمل کا سب سے زیادہ محتاج قیامت کے دن ہوگا

جو لوگ قرآن کی مذکورہ آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھ رہے تھے، انھوں نے باغ کو لفظی طور پر بس باغ کے معنی میں لے لیا۔ مگر جو لوگ آیت کو باطنی مطلع سے دیکھ رہے تھے انھوں نے اس کو تمثیل کے معنی میں لیا۔ پہلے مفہوم میں آیت صرف دنیا کے پھل کے ملنے اور پھر چھن جانے کے معنی میں تھی۔ مگر دوسرے مفہوم میں وہ آخرت کی عظیم حقیقت کو واضح کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو خلافت کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ کوئی کہتا خلیفہ کا انتخاب مہاجرین میں سے ہونا چاہئے، کوئی کہتا کہ انصار میں سے۔ کوئی اس منصب کے لئے ایک شخصیت کا نام لیتا اور کوئی دوسری شخصیت کا۔ اس سلسلے میں ابن ابی شیبہ نے ابن سیرین سے جو روایت نقل کی ہے اس کا ایک حصہ یہ ہے:

واتی الناس عند بیعۃ ابی بکر ابا عبیدۃ بن الجراح فقال: تاتونی وفیکم ثانی اثنین (کنز العمال، جلد ۳ صفحہ ۱۴۰)

ابوبکر رضؓ سے بیعت کے وقت کچھ لوگ ابوعبیدہ بن جراحؓ کے پاس آئے۔ انھوں نے جواب دیا: تم لوگ خلافت کے لئے میرے پاس آئے ہو جب کہ تمھارے درمیان ثانی اثنین (ابوبکرؓ) ہیں۔

ہجرت کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ کی طرف سفر کیا تو آپ کا قافلہ صرف دو آدمیوں پر مشتمل تھا۔ ایک آپ اور دوسرے حضرت ابوبکر۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: جب کافروں نے اس کو نکالا۔ جب وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے (اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار، توبہ ۴۰)

جو لوگ لفظی سطح پر قرآن کو دیکھ رہے تھے، ان کے لئے یہ مسئلہ ابھی غیر طے شدہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مگر جو لوگ قرآن کو معنوی سطح سے دیکھ رہے تھے، ان کے لئے قرآن کی یہ

آیت خلافت کی ترتیب کے سوال کو پہلے ہی طے کر چکی تھی۔ قرآن میں ثانی اثنین (دو میں کا دوسرا) کے لفظ میں انھوں نے خدا کی اس منشا کو پالیا کہ اس کے نزدیک ابو بکر دو میں کے دوسرے ہیں، وہ رسول خدا کے بعد نمبر دو پر ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں یہ معنوی اشارہ پانے کے بعد ان کے لئے اس معاملہ میں اختلاف و انتشار کا کوئی سوال نہ تھا ——— جن لوگوں نے آیت کو ظاہری مطلع سے دیکھا ان کو یہ آیت صرف غار ثور کے ایک تاریخی واقعہ سے متعلق نظر آئی۔ مگر جن لوگوں نے قرآن کی آیت کو باطنی مطلع سے دیکھا ان کے لئے وہ ترتیب خلافت کے نازک سوال کا جواب بن گئی۔

یہی معاملہ پورے دین اور پورے قرآن کا ہے۔ ایک دین داری اور قرآن فہمی وہ ہے جو ظاہری سطح پر ہوتی ہے۔ آدمی بس ظاہری چیزوں کو جانتا ہے اور ان کے مطابق عمل کرتا ہے۔ دوسری دینداری اور قرآن فہمی وہ ہے جو گہرائیوں میں اتری ہوئی ہو۔ آدمی الفاظ یا ظواہر سے گزر کر اندر چھپے ہوئے حقائق تک پہنچ جائے۔ وہ خدا کو اس کے غیبی روپ میں دیکھ لے۔ یہ دوسرا آدمی بھی بظاہر دیکھنے میں پہلے آدمی کی طرح ہوتا ہے مگر نفسیات کے اعتبار سے وہ بالکل دوسرا انسان ہوتا ہے۔ اس کی منصوبہ بندی اور پہلے شخص کی منصوبہ بندی میں اتنا ہی فرق ہوتا ہے جتنا خدائی منصوبہ بندی اور انسانی منصوبہ بندی میں۔

معرفت کی اس دہری سطح کا تعلق شخصی دینداری سے بھی ہے اور اجتماعی دینداری سے بھی۔ ایک شخص جس کی رسائی "سطور" تک ہو وہ قرآن کی آیتوں سے صرف ایک ایسا دین لے سکے گا جو اس کے ظاہری جسم کو چھوئے مگر اس کے اندرون تک نہ اترے۔ اس کے برعکس جس کی رسائی "بین السطور" تک ہوگی وہ قرآن کی اسی آیت میں ایسے معانی پالے گا جو اس کی روح کے لئے ربانی غذا بن جائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ تقویٰ کا لباس زیادہ بہتر ہے (الاعراف ۲۶) یہاں عام آدمی نے لباس سے جسمانی کپڑا مراد لے لیا اور لباس تقویٰ کا مطلب یہ سمجھا کہ وہ لباس جس کی وضع قطع شرعی حدود کے مطابق ہو۔ مگر اسی آیت کو عروہ بن الزبیر نے پڑھا تو انھوں نے پایا کہ یہاں لباس کا لفظ تمثیلی مفہوم میں ہے۔ انھوں نے لباس التقویٰ کی تشریح خشیۃ اللہ سے کی۔ یعنی جس طرح جسم انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ ملبوس ہو اسی طرح روح انسانی کی زینت یہ ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والی ہو (تفسیر ابن کثیر)

یہی معاملہ دین کے اجتماعی پہلو کا ہے۔ اجتماعیات میں دین کو قائم کرنا ایک ظاہری سطح کے اعتبار سے ہوتا ہے اور ایک باطنی سطح کے اعتبار سے۔ غزوۂ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر عام مسلمان اس انداز میں سوچتے تھے کہ جہاد یہ ہے کہ کافروں سے لڑ جائیں۔ کیونکہ عزت کی موت ذلت کی زندگی سے بہتر ہے۔ مگر پیغمبر خدا اور ابو بکر صدیق کو نظر آیا کہ اسلام کی فتح اس میں ہے کہ کافروں کی تمام شرطیں مان کر ان سے ناجنگ معاہدہ کر لیا

جائے تاکہ حالات معتدل ہوں اور اسلام کے لئے دعوتی عمل کی راہ کھل جائے۔ ظاہر بین لوگ معاملہ کو تلوار کی سطح پر حل کرنا چاہتے تھے۔ مگر حکمت وبصیرت کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو نظر آیا کہ معاملہ کو دعوت کے میدان تک لے جائیں۔ کیونکہ دعوت کا میدان وہ میدان ہے جہاں اسلام کو ابدی فوقیت حاصل ہے۔

یہی مثال ایک اور پہلو سے حضرت حسن اور حضرت حسین کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ دونوں کو بالکل یکساں قسم کی صورت حال سے سابقہ پیش آیا۔ حضرت حسن کے سامنے معاویہ بن ابی سفیان کا مسئلہ تھا اور حضرت حسین کے سامنے یزید بن معاویہ کا۔ حضرت حسین نے معاملہ کو اس کی نظری صورت میں بس حق اور ناحق کے اعتبار سے دیکھا۔ وہ حق کے علم بردار بن کر ناحق سے لڑ گئے۔ اس کے برعکس حضرت حسن نے معاملہ کو عملی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ ان کو مفید بات یہ نظر آئی کہ وہ ٹکراؤ کو ختم کرکے خانہ نشین ہوجائیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت حسین کے حصہ میں صرف یہ آیا کہ وہ ناحق کو بدستور زندہ چھوڑ کر کربلا کے میدان میں شہید ہوجائیں۔ اور حضرت حسن کے طرز عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو سیاسی استحکام مل گیا اور باہمی لڑائی ختم ہوکر اسلام کی توسیع کا کام از سرنو پوری قوت کے ساتھ شروع ہوگیا۔

اجتماعی معاملات میں گہری سیاست کو پانے کا راز صبر ہے۔ اس کے برعکس سطحی سیاست کا سبب بے صبری۔ مسلمان اس زمین پر اکیلے نہیں ہیں بلکہ دوسرے گروہوں کے ساتھ ہیں۔ یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے اور یہاں ہر ایک کو عمل کا موقع ہے، خواہ وہ عادل ہو یا ظالم۔ اب اگر ایسا ہو کہ مسلمانوں کو جب بھی کسی شخص یا گروہ کی طرف سے کوئی گزند پہنچے تو وہ فوراً مشتعل ہوجائیں اور وقتی جذبات کے تحت اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو وہ ہمیشہ سطحی کارروائیاں کریں گے اور اس کے نتیجہ میں ہمیشہ ناکام رہیں گے۔

لیکن اگر مسلمان ایسا کریں کہ گزند کے ابتدائی جھٹکے کو سہہ لیں، وہ مشتعل نہ ہوکر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور کریں۔ وہ اپنی کمزوریوں اور فریق ثانی کی قوتوں کا جائزہ لیں اور خالص حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے یہ رائے قائم کریں کہ واقعہ کا اصل سبب کیا ہے اور اس کو کوئی مزید خرابی لائے بغیر کس طرح دور کیا جاسکتا ہے۔ اگر مسلمان اس "صابرانہ" طریقہ کو اختیار کریں تو یقینی طور پر وہ گہری سیاست کو پالیں گے اور گہری سیاست اختیار کرنے والے کے لئے کبھی ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔

بے صبری آدمی کو جذباتی عمل یا سطحی کارروائیوں کی طرف لے جاتی ہے اور صبر آدمی کو منصوبہ بند عمل کا راستہ دکھاتا ہے اور امتحان کی اس دنیا میں سطحی عمل کے مقابلہ میں منصوبہ بند عمل ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔

طریق مطالعہ

حضرت آدم علیہ السلام کی امت دجلہ وفرات کے درمیانی علاقہ میں بسی ہوئی تھی جس کو تاریخ میں میسوپوٹامیا کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس وقت کے مسلمان تھے۔ جب ان میں بگاڑ آیا تو ان کی اصلاح کے لئے خدا کے پیغمبر حضرت نوح بھیجے گئے۔ مگر قوم اپنی غفلت اور سرکشی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئی۔ بالآخر ان پر عظیم سیلاب کی صورت میں خدا کا عذاب آیا۔ حضرت نوح اپنے تھوڑے سے پیروؤں کے ساتھ ایک کشتی میں سوار ہو گئے ۔ صرف یہی کشتی اور اس کے سوار سیلاب کی زد سے بچے، باقی تمام لوگ غرق کر دئے گئے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت نوح کا ایک لڑکا آنجناب کا ساتھ دینے پر راضی نہیں ہوا تھا، وہ بھی عمومی سیلاب کی زد میں آگیا۔ حضرت نوح نے اس کو پکارا کہ ہماری کشتی میں آجاؤ۔ لڑکے نے جواب دیا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاتا ہوں، وہ مجھ کو اس طوفان سے بچالے گا۔ پیغمبر نے کہا کہ آج کوئی چیز کسی کو امر اللہ سے بچانے والی نہیں (ہود ۴۳) حضرت نوح سیلاب کو ایک خدائی معاملہ سمجھتے تھے اس لئے وہ اس کو دیکھ کر خدا کی کشتی میں داخل ہو گئے۔ مگر ان کے لڑکے نے اس کو صرف ایک موسمی معاملہ سمجھا اس لئے وہ پہاڑ کی طرف بھاگا۔ یہ فرق اتنا بنیادی تھا کہ ایک نے نجات پائی اور دوسرے کو سیلاب کی موجوں نے نگل لیا ـــــــــــ کسی طوفان کو اگر آپ خدائی معاملہ سمجھیں تو آپ خدا کی طرف دوڑیں گے، آپ کے اندر تضرع کی کیفیت ابھرے گی (انعام ۴۲) اس کے برعکس اگر آپ اس کو عام اسباب کے تحت واقع ہونے والا معاملہ قرار دیں تو آپ کے اندر صرف غفلت اور سرکشی پیدا ہوگی، جیسا کہ حضرت نوح کے لڑکے میں پیدا ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان ایک بہت بڑے طوفان سے دوچار ہیں۔ وہ یہ کہ مسلمان ساری دنیا میں کافر قوموں اور بے دین طاقتوں کی زد میں آگئے ہیں۔ خواہ مسلم اکثریت کے علاقے ہوں یا مسلم اقلیت کے، غیر مسلم قومیں ہر جگہ مسلم قوموں کو اپنے نشانہ پر لئے ہوئے ہیں۔ یہ قومیں کہیں براہ راست طور پر مسلمانوں کو مغلوب کئے ہوئے ہیں اور کہیں خود مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو ان کے دوسرے گروہ کے خلاف استعمال کر کے بالواسطہ طور پر اپنے ظالمانہ ارادے پورے کر رہی ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں خدا نے بار بار وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے (الانفال ۱۹) وہ اہلِ ایمان کی طرف سے دفاع کرتا ہے (الحج ۳۸) وہ ہرگز کافروں کو ان پر غالب آنے کا موقع نہیں دے گا (النساء ۱۴۱) اس لئے لازماً یہ ماننا پڑے گا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہ مسلمانوں کے حق میں خدائی تنبیہ ہے۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہے نہ کہ محض ایک انسانی معاملہ۔ مگر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز اس سلسلے

میں کیا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان آج مختلف الفاظ میں ایک ہی بات کو دہرا رہے ہیں: یہ مسلمانوں کے خلاف اسلام دشمن طاقتوں کی سازش ہے۔ ہمارے تمام لکھنے والے قلم اور تمام بولنے والی زبانیں اسی ایک بات کو ثابت کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ کسی کو بھی ان واقعات میں خدا کا ہاتھ کام کرتا ہوا نظر نہیں آتا۔ البتہ کسی نے اس میں "وہائٹ ہاؤس" کا ہاتھ دریافت کر رکھا ہے اور کسی نے "ریڈ ہاؤس" کا۔ کوئی کسی مشرک قوم کو الزام دے رہا ہے اور کوئی کسی کافر قوم کو۔

یہ واحد سب سے بڑی گمراہی ہے جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلم قائدین مبتلا ہیں۔ انھوں نے ایک کھلے ہوئے خدائی واقعہ کو انسانی واقعہ کے خانہ میں ڈال دیا ہے۔ حضرت نوح کے لڑکے نے اپنے زمانہ کے طوفان کے بارے میں جو غلطی کی تھی ٹھیک وہی غلطی مسلمان موجودہ زمانہ کے طوفان کے بارے میں کر رہے ہیں۔ وہ ایک خدائی معاملہ کو انسانی معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھتے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرتے۔ ان کے اندر اپنی اصلاح کا جذبہ ابھرتا۔ ان کی ساری سوچ خدارخی سوچ بن جاتی۔ مگر جب اس کو انھوں نے انسانی سازش قرار دیا تو اس کے بعد یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے اندر دوسری قوموں کے خلاف نفرت اور انتقام کا جذبہ ابھرے۔ خدا کو آدمی قادر مطلق جانتا ہے۔ اس لئے جب کسی سختی کو خدا کی طرف سے سمجھا جائے تو اس کے جواب میں اس کے اندر عجز کی نفسیات ابھرتی ہے۔ اس کے برعکس انسان کو وہ اپنے جیسا سمجھتا ہے اس لئے جب کسی سختی کو انسان کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کے جواب میں نفرت اور انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں بہت بڑے پیمانہ پر یہی دوسرا واقعہ پیش آیا ہے۔

کتاب آسمانی کی حامل قوموں کے لئے خدا کا یہ خاص قانون ہے کہ ان کے اندر جب بگاڑ آتا ہے تو ان پر خدا کی طرف سے تنبیہی سزائیں آتی ہیں تاکہ وہ جاگیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ یہود جو پچھلے دور کے حامل دین تھے، ان پر ان کے بگاڑ کے نتیجہ میں بار بار اس قسم کی تنبیہی سزائیں آتی رہیں۔ بائبل میں تفصیل سے ان تنبیہات کا ذکر ہے۔ حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے کی سزاؤں کا ذکر زبور، یسعیاہ، یرمیاہ اور حزقی ایل میں موجود ہے اور حضرت مسیح کے بعد کی سزا کا ذکر متی اور لوقا کی انجیلوں میں ملتا ہے۔ مثلاً ایک کتاب میں یہود کے بگاڑ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اس لئے خداوند کا قہر اپنے لوگوں پر بھڑکا اور اسے اپنی میراث (اسرائیل) سے نفرت ہو گئی اور اس نے ان کو قوموں کے قبضہ میں کر دیا اور ان سے عداوت رکھنے والے ان پر حکمراں بن گئے (زبور باب ۱۰۶)

یہود کے ساتھ خدا نے جو معاملہ کیا اس کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے: اور ہم نے بنی اسرائیل کو اپنے اس فیصلہ سے کتاب میں آگاہ کر دیا تھا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے۔ پس جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو ہم نے تمہارے اوپر ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے۔

وہ تمھارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے۔ یہ ایک وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔ پھر ہم نے تمھاری باری ان پر لوٹائی اور مال واولاد سے تمھاری مدد کی اور تمھاری تعداد بڑھادی۔ اگر تم اچھے کام کروگے تو اپنے لئے کروگے۔ اور اگر تم برے کام کروگے تو اپنے لئے کروگے۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تمھارے اوپر مسلط کیا تاکہ وہ تمھارے چہرے بگاڑدیں اور مسجد (بیت المقدس) میں گھس پڑیں جس طرح پہلی بار گھس پڑے تھے اور تاکہ جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اس کو تہس نہس کر ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہ تمھارا رب تم پر رحم فرمائے اور اگر تم پھر وہی کروگے تو ہم بھی وہی کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے (بنی اسرائیل ۸-۴)

جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے ظاہر ہے، یہود پر خدا کی یہ سزائیں انسانی ہاتھوں سے جاری کی گئیں۔ مثلاً ۷۲۱ ق م میں سامریہ کو مغلوب کرکے حکومت اسرائیل کا خاتمہ کر دیا گیا۔ ہزاروں یہودی مار ڈالے گئے۔ فلسطین کے بڑے حصہ سے یہودیوں کو نکال کر وہاں غیر قوم کے لوگوں کو بسا دیا گیا۔ یہ کام خدا کے فرشتوں نے آکر انجام نہیں دیا بلکہ یہ اشوری فرماں روا سارگون (Sargon II) تھا جس نے اس خدائی سزا کو یہود کے اوپر نافذ کیا —
۵۸۶ ق م میں جب یروشلم کے یہودی قتل کئے گئے اور غلام بنائے گئے اور بیت المقدس کو جلا دیا گیا تو یہ کام بھی آسمانی طاقتوں کے ذریعہ نہیں ہوا بلکہ بابل کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے یہ سارے کام انجام دئے۔ ۱۶۸ ق م میں بیت المقدس پر حملہ ہوا۔ یہودیوں کو غلام بنا کر ان کے مقدس صحیفوں کو جلا دیا گیا۔ اس بار بھی یہ کام مافوق ذرائع سے نہیں ہوا بلکہ شام کا بادشاہ انطیوخوس چہارم (Antiochus IV) تھا جس نے یہود کے خلاف یہ تمام سفاکیاں کیں۔ ۶۳ ق م میں ایک اجنبی قوم فلسطین میں داخل ہوئی۔ اس نے بیت المقدس پر قبضہ کرکے یہودیوں کو اپنا غلام بنالیا۔ یہ واقعہ جس کے ذریعہ سے ہوا وہ دوبارہ کوئی آسمانی مخلوق نہیں تھی بلکہ یہ رومی فاتح پومپی (Pompey) تھا جس نے اس عمل کو انجام دیا۔ اسی طرح ۷۰ء میں بیت المقدس پر حملہ ہوا اور ہیکل سلیمانی کو ڈھا دیا گیا۔ یہود کے مقدس شہر کو ملبہ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ یہودی قتل ہوئے اور بقیہ غلام بنالئے گئے۔ اس بار بھی یہ کام خود خدا نے ظاہر ہو کر نہیں کیا بلکہ یہ رومی بادشاہ ٹیٹس (Titus) تھا جس نے اس تخریبی منصوبہ کو مکمل کیا۔

اس طرح کے تمام واقعات کے بارے میں یہودی کہتے ہیں کہ وہ اسرائیل دشمن طاقتوں کی سازش تھی، ان کا خدائی سزا سے کوئی تعلق نہیں۔ ان واقعات کی انسانی نوعیت انھیں یہ کہنے کا پورا موقع دے رہی ہے۔ مگر قرآن اور بائبل دونوں سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ یہ سب یہود کے حق میں خدا کی تنبیہی سزائیں تھیں جو انسانوں کے ہاتھوں ان کے اوپر جاری کی گئیں۔ یہود اگر ان واقعات کو خدا کی طرف سے سمجھتے تو ان کے اندر توبہ اور انابت

کا جذبہ ابھرتا ، وہ تقویٰ اور اطاعت کی زندگی اختیار کرتے۔ مگر جب انھوں نے ان واقعات کو اسرائیل دشمن طاقتوں کا ظلم قرار دیا تو اس نے صرف ان کی غفلت اور سرکشی میں اضافہ کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا اپنی سزا کو کھلے فرشتوں کے ذریعہ نہیں بھیجتا۔ بلکہ عام انسانی واقعات کے درمیان ان کا نفاذ کرتا ہے۔ تاکہ امتحان کا پردہ باقی رہے۔ جن کے اندر کچھ صلاحیت موجود ہے وہ اس کو خدائی معاملہ سمجھ کر چوکنے ہوں اور اپنی اصلاح کر لیں۔ اور جو لوگ بے حسی اور غفلت میں ڈوب چکے ہیں وہ اس کو انسان کا ظلم اور سازش قرار دے کر اپنی سرکشی میں اضافہ کرتے رہیں۔

مسلمان آج جن ناموافق حالات میں اپنے کو گھرا ہوا پاتے ہیں ان کو دشمنوں کی کارروائی قرار دینے کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا پورا طرز فکر منفی اور غیر حقیقت پسندانہ ہو کر رہ گیا ہے، ان کے اندر وہ مثبت ذہن نہیں ابھرا جو کسی صالح اور نتیجہ خیز جدوجہد کی لازمی بنیاد ہے۔

حالات کو ظلم اور سازش کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی بنا پر انھیں کسی معاملہ میں اپنی غلطی نظر نہیں آتی، وہ بس دوسروں کو یک طرفہ الزام دیتے رہتے ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کا دینی طرز فکر بالکل سیاست رخی ہو گیا ہے جب کہ صحیح مسلم فکر وہ ہے جو آخرت رخی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک بے کردار قوم بن کر رہ گئے ہیں، کیونکہ کردار اپنے آپ پر ذمہ داری لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ حقوق طلبی کے سوا اپنی کوئی ذمہ داری جانتے ہی نہیں۔ اسی سبب سے ایسا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا طرز عمل اصولی کے بجائے قومی ہو گیا ہے، کیونکہ جو لوگ دوسروں کو اپنا قومی حریف سمجھیں ان کی روش قدرتی طور پر قومی ہو جائے گی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ آپس کی لڑائی آج مسلمانوں میں تمام قوموں سے زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ غیروں کو جب وہ اپنی جھنجلاہٹ کا شکار نہیں بنا پاتے تو اپنوں ہی کے اوپر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔

پھر اسی غلط فکری کا یہ عظیم نقصان مسلمانوں کے حصہ میں آیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر دعوتی ذہن نہیں ابھرا جو کہ امت مسلمہ کا اصل مقصد وجود ہے۔ دوسری قوموں کو خدا کے دین رحمت کا مدعو بنانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ داعی کے دل میں ان کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پایا جاتا ہو۔ مگر ظلم اور سازش کی اصطلاحوں میں سوچنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کے بارے میں مسلمانوں کے اندر مخالفانہ نفسیات پیدا ہو گئی۔ مسلمانوں کے دل میں ان مدعو اقوام کے لئے نفرت اور بیزاری کے سوا کسی اور جذبہ کی گنجائش ہی نہ تھی، پھر وہ ان کو دین رحمت کا مخاطب بناتے تو کیوں کر بناتے۔

ذہنی بیداری

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بستیوں کے لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے۔ مگر انھوں نے جھٹلایا (الاعراف ۹۶) یہی بات یہود کے بارے میں کہی گئی ہے کہ انھوں نے نبی آخرالزماں کو جھٹلادیا، اگر وہ ان پر ایمان لاتے تو وہ اپنے اوپر سے بھی کھاتے اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی اپنا رزق حاصل کرتے (المائدہ ۶۶)

ایک رسول کا اقرار کرنے پر اتنی زیادہ برکتوں کی خوش خبری کیوں دی گئی — بہت سے لوگ اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمۂ ایمان میں طلسماتی اوصاف چھپے ہوئے ہیں اور زبان سے اس کا تلفظ کرتے ہی اسی طرح تمام خزانوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جس طرح قدیم افسانوی کہانی میں "سم سم" کہنے سے ایک شخص کے لئے خزانوں کا محل کھل گیا تھا۔ مگر اس قسم کا خیال سراسر بے بنیاد ہے۔ اگر ان برکتوں کا تعلق کلمۂ ایمان کی لفظی ادائگی سے ہوتا تو آج مسلمانوں کی زندگیوں میں ہر زمانہ سے زیادہ اس کا ظہور ہو رہا ہوتا۔ کیونکہ کلمۂ ایمان کا تلفظ کرنے والے آج ہر زمانہ سے زیادہ عظیم مسلم امت (ایک ارب) کی صورت میں زمین کے اوپر موجود ہیں۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایمان کے مدعیوں کی بے پناہ کثرت کے باوجود آج ان کے لئے نہ آسمانی برکتوں کے دروازے کھل رہے ہیں اور نہ زمینی برکتوں کے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں ایمان کا لفظ فکری انقلاب کے ہم معنی ہے۔ اس وقت جو لوگ آپ پر ایمان لائے ان کے لئے ایمان کا مطلب واضح طور پر ایک ذہنی فیصلہ تھا۔ اس حقیقت کو بآسانی اس وقت سمجھا جاسکتا ہے اگر یہ دیکھا جائے کہ جب یہ آیتیں اتریں اس وقت یہود کے لئے یا عرب کے لوگوں کے لئے ایمان لانے کا مطلب عملاً کیا تھا۔

آج جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیتے ہیں تو یہ لفظ بولتے ہی ہمارے ذہن میں وہ مسلّمہ شخصیت آجاتی ہے جس کے ساتھ ڈیڑھ ہزار برس کی تاریخی عظمتیں وابستہ ہو چکی ہیں۔ مگر بعثت کے وقت لوگوں کی نظر میں آپ صرف "محمد بن عبداللہ" تھے۔ اس وقت یہ ساری تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح بس ایک معمولی انسان نظر آتے تھے۔ مگر یہود کا اور مشرکین عرب کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہود کو ایک ایسے دین کا حامل ہونے کا فخر حاصل تھا جس کی حیثیت معروف و مسلّم تھی۔ ان کے دین کے ساتھ موسیٰ اور داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے کتنے سابق پیغمبروں کے نام شامل تھے جو لمبی تاریخ کے نتیجہ میں لوگوں کے ذہنوں پر اپنی عظمت قائم کر چکے تھے۔ یہی حال عرب کے مشرکین کا تھا۔

وہ اپنے سلسلہ کو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ جیسے قدیم پیغمبروں سے جوڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے کو کعبہ کا وارث اور ملت ابراہیمی کا حامل سمجھتے تھے، اور یہ وہ چیزیں تھیں جن کی تاریخی اہمیت سیکڑوں برس کی روایات کے نتیجہ میں تسلیم شدہ بن چکی تھی۔ بالفاظ دیگر، پیغمبر اسلام اپنی تاریخ کے آغاز پر تھے اور یہود اور قبائل عرب اپنی تاریخ کے اختتام پر۔

ایسی حالت میں چودہ سو سال پہلے والے پیغمبر اسلام کو ماننا اور آپ کا ساتھ دینا ان لوگوں کے لئے کوئی سادہ واقعہ نہ تھا۔ یہ قائم شدہ دین سے نکل کر ایک ایسے دین کو اختیار کرنا تھا جو ابھی قائم نہیں ہوا تھا۔ یہ مفادات سے وابستہ سچائی کو چھوڑ کر مجرد سچائی کو اختیار کرنا تھا۔ یہ مادی عظمتوں سے اوپر اٹھ کر غیر مادی عظمتوں کا ادراک کرنا تھا۔ یہ حال کے پردہ میں مستقبل کا مشاہدہ کرنا تھا۔ یہ محسوس خداؤں سے گزر کر چھپے ہوئے خدا کو پالینا تھا۔

اس قسم کا واقعہ کسی انسان کی زندگی میں اس طرح پیش نہیں آتا جیسے وہ ایک کمرہ سے نکل کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا ہو۔ اس قسم کا واقعہ آدمی کی زندگی میں ہمیشہ بھونچال بن کر داخل ہوتا ہے۔ یہ ایک شعوری انقلاب ہوتا ہے جب کہ آدمی سوچے سمجھے ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑتا ہے اور سوچے سمجھے ارادہ کے تحت دوسری چیز کو لے لیتا ہے۔ اس میں آدمی کی قوت فیصلہ متحرک ہوتی ہے۔ اس کے جذبات میں عظیم ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ اس کو قربانیوں کے پل کو پار کر کے ایک طرف سے دوسری طرف جانا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی پوری زندگی اس طرح ہل جاتی ہے جیسے کوئی طوفان کسی درخت کو ہلا دے۔ جب کچھ لوگ اس طرح انقلابی انداز میں ایک نظریہ کو اختیار کریں تو اس کے بعد عین قانون قدرت کے تحت ایسا ہوتا ہے کہ زمین پر بالکل نئے قسم کے انسان وجود میں آتے ہیں۔ اور ان کے ملنے سے وہ سماج بنتا ہے جس سے ایسے حیرت ناک نتائج برآمد ہوں جو اس سے پہلے آسمان نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ جب عرب میں اسلام کی آواز بلند کی تو اس وقت دوسرے ادیان کا حال یہ تھا کہ وہ پہلے سے چلے آرہے تھے اور اس بنا پر دہ جمے ہوئے مفادات کی بنیاد پر قائم ہو چکے تھے۔ اسلام ابھی ایک مجرد نظریہ تھا، جب کہ دوسرے ادیان نے منظم ادارہ (Institution) کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایسی حالت میں اسلام کو اپنا دین بنانا ماحول کے اندر بے قیمت ہو جانے کے ہم معنی تھا۔ دوسرے ادیان سے وابستہ ہو کر آدمی کے تمام مفادات محفوظ رہتے تھے۔ وہ سماج کا معزز رکن شمار ہوتا تھا۔ مگر اسلام کو اختیار کرتے ہی وہ ایک ایسے دین کا فرد بن جاتا تھا جس نے سماج کے اندر اپنی حیثیت مسلّم نہیں کی تھی۔ جس کے ساتھ ابھی تک مفادات وابستہ نہیں ہوئے تھے۔ وہ پُر فخر روایات والے

گروہ سے چھوٹ کر ایک ایسے گروہ کا جزء بن جاتا تھا جس کے ساتھ ابھی پُر فخر روایات وابستہ نہ ہوئی ہوں۔ ایسی حالت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ان کے لئے اسلام محض ایک کلمہ کا تلفظ نہ تھا بلکہ ایک انقلابی فیصلہ کے ہم معنی تھا۔ اسلام کی آواز نے ان کے خیالات کی دنیا میں ایک زبردست ہلچل پیدا کی۔ ان کی تمام فکری قوتیں جاگ اٹھیں۔ ان کے اندر شدت سے یہ ذہن ابھرا کہ اپنے آپ پر نظر ثانی کریں۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ انھوں نے بے پناہ ارادہ کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور بے پناہ ارادہ کے تحت دوسری چیز کو اختیار کر لیا۔

ایسا کرتے ہوئے انھوں نے تعصبات کے پردہ کو چاک کیا۔ مفادات اور مصلحتوں کو نظر انداز کیا۔ یہ خطرہ مول لیا کہ اپنے خاندان، اپنے قبیلہ اور اپنے سماج سے کٹ کر وہ دنیا میں اکیلے رہ جائیں۔ انھوں نے ایک شعوری فیصلہ کے تحت اپنے آپ کو تقلیدی زمین سے کھینچ کر ہٹایا اور شعوری فیصلہ کے تحت ایک زندہ عقیدہ کی زمین پر اپنے کو کھڑا کیا —— دور اول کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک فکری انقلاب کے ہم معنی تھا اس لئے اس ایمان سے جو لوگ پیدا ہوئے وہ بھی انقلابی انسان تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لئے ایمان ایک بے روح عقیدہ ہے اس لئے اس ایمان سے جو افراد تیار ہوتے ہیں وہ بھی بے روح انسان ہیں، ان میں نہ فکر کے اعتبار سے کوئی جان ہوتی ہے اور نہ کردار کے اعتبار سے۔

کتاب رو پی دین اور سماج رو پی دین

حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسلام اجنبی حالت میں شروع ہوا اور پھر وہ پہلے کی طرح اجنبی ہو جائے گا۔ پس مبارکی ہے اجنبیوں کے لئے (بدأ الاسلام غریبا و سیعود کما بدأ فطوبیٰ للغرباء) اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں جس طرح اجنبی بننے کی قیمت پر لوگوں کو اسلام ملا تھا اسی طرح بعد کے دور میں بھی جس کو اسلام ملے گا اجنبی بننے کی قیمت پر ملے گا۔

غور سے دیکھئے تو آج تاریخ دوبارہ وہیں لوٹ آئی ہے جہاں سے وہ شروع ہوئی تھی۔ آج ایک دین وہ ہے جو قرآن میں محفوظ ہے، دوسرا دین وہ ہے جو مسلمانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ پہلے دین کو کتاب روپی دین کہہ سکتے ہیں اور دوسرے دین کو سماج روپی دین۔ کتاب روپی دین وہ ہے جو قرآن وسنت میں محفوظ ہے۔ یہ دین گویا آج پیغمبر کا نمائندہ ہے۔ مگر یہ دین آج ماحول کے اندر اسی طرح اجنبی بن گیا ہے جس طرح وہ چودہ سو سال پہلے اجنبی تھا۔ دوسری طرف سماج روپی دین اسی طرح مکمل طور پر ایک منظم ادارہ بنا ہوا ہے جس طرح قدیم زمانہ میں یہودیت تھی۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں اسی دوسرے اسلام کی زمین پر چل رہی ہیں۔ بظاہر کوئی کلّی اسلام کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے اور کوئی جزئی اسلام کا۔ مگر یہ تمام تحریکیں حقیقۃً سماج روپی دین کی سطح پر ابھری ہیں نہ کہ کتاب روپی دین کی سطح پر۔

صورت حال یہ ہے کہ آج اسلام میں اسی طرح گدیاں بن چکی ہیں جس طرح وہ پہلے یہودیت میں پائی جاتی تھیں۔ اسلام اب ایک ایسا نام بن گیا ہے جس کے اوپر چندے اور عہدے ملیں۔ جس کے نعرے پر عوام کی بھیڑ جمع کی جاسکے۔ جس کی بنیاد پر شخصیتیں بنیں اور قیادتیں ابھریں۔ اسلام آج ایک ایسا عنوان ہے جس کے سہارے ادارے قائم ہوں اور خطابات حاصل ہوں۔ اسلام آج ہر اعتبار سے ایک عظیم ترین مارکٹ ہے جس سے وہ تمام مادی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں جو دنیا کے عام بازاروں سے کسی کو حاصل ہوتے ہیں۔

دوسری طرف کتاب والا دین عملاً بے جگہ ہوچکا ہے۔ وہ محض ایک ذہنی تخیل کے طور پر فضا میں باقی ہے۔ کوئی شخص اگر اس کتاب والے دین کو اپنائے تو فوراً وہ محسوس کرے گا کہ وہ اپنے ماحول کے درمیان اجنبی ہوگیا ہے۔ ایسے آدمی کو اپنے اسلام کی یہ قیمت دینی پڑے گی کہ وہ لوگوں کو نئے دین کا حامل معلوم ہو۔ وہ بڑی بڑی دینی مجالس میں شرکت کے لئے نااہل قرار پائے۔ اونچی گدیوں میں سے کوئی گدی اس کو نہ ملے۔ قرآن سے گہرا تعلق رکھنے کے باوجود اس کو قرآنی جشن کی صدارت کے لئے نہیں بلایا جائے گا۔ حدیث کا عالم ہونے کے باوجود وہ کسی دینی مدرسہ کا شیخ الحدیث نہ بن سکے گا۔ مخلص اور متقی ہونے کے باوجود اس کا شمار بزرگوں میں نہیں ہوگا۔ دین کا گہرا فہم رکھنے کے باوجود دینی مسائل میں اس سے رجوع نہیں کیا جائے گا۔ خدا اور رسول کی خاطر اپنی زندگی وقف کر دینے کے باوجود اس کو کسی دینی خطاب کا اہل نہیں سمجھا جائے گا۔ اور ان سب کی وجہ یہ ہوگی کہ ایسا آدمی جس دین پر قائم ہے وہ کتاب وسنت والا دین ہے اور منظم مذہب (Institutionalized Religion) کو ماننے والوں کے درمیان خالص کتاب و سنت والا دین اجنبی بن چکا ہے۔ لوگ دین کے نام سے جس چیز سے واقف ہیں وہ کچھ خارجی نقشے ہیں نہ کہ گہری ربانی حقیقتیں۔ وہ واقعات انسانی سے اپنا دین لے رہے ہیں نہ کہ واقعات خداوندی سے۔

شاہ ضرب

کیرم ایک گھریلو کھیل ہے۔ یہ کھیل ایک تختہ (بورڈ) پر کھیلا جاتا ہے۔ ایک بڑے چوکور تختہ کے بیچ میں روپیہ جیسی ۱۹ گوٹیں مرتب مجموعہ کی صورت میں سمیٹ دی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کھیل کا آغاز کرنے والا ایک خاص گوٹ (اسٹرائکر) لے کر تختہ کے ایک کونہ سے گوٹوں کے درمیانی مجموعہ پر نشانہ لگاکر پوری قوت سے مارتا ہے۔ اس کی مار اگرچہ مجموعہ کے صرف ایک نقطہ پر پڑتی ہے۔ لیکن مار اگر کامیاب ہے تو وہ گوٹوں کے پورے مجموعہ کو متاثر کر دیتی ہے۔ اب ایک ایک گوٹ اپنی جگہ سے ہٹ کر کھلاڑی کی زد میں آجاتی ہے۔ ایسی کامیاب مار کو کیرم بورڈ کی اصطلاح میں شاہ ضرب (Master Stroke) کہتے ہیں۔

خدا کے دین کو از سر نو زندہ کرنے کے لئے بھی اسی قسم کے ایک شاہ ضرب کی ضرورت ہے۔ یہ شاہ

ضرب وہ ہے جو تنظیمی مذہب یا سماج روپی دین پر جمے ہوئے لوگوں کو اپنی جگہ سے ہلا دے اور ان کو ذہنی اعتبار سے اس مقام پر لائے جہاں وہ کتاب وسنت والے دین کے مخاطب بن سکیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہی واقعہ پیش آیا تھا۔ اب اسی واقعہ کو دوبارہ ظہور میں لانے کی کوشش کا نام تجدید دین ہے۔ آج تجدید دین کا مطلب اسی کار نبوت کو دہرانا ہے۔ نبی نے اپنے زمانہ میں سابقہ ادیان کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے دین کو زندہ کیا تھا۔ آج خود اسلام کی بنیاد پر قائم شدہ ڈھانچہ کے مقابلہ میں خدا کے خالص دین کو از سر نو زندہ کرنا ہے۔

اس عمل کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ لوگوں کا دینی جمود ٹوٹے۔ شخصیتوں اور اداروں میں اٹکے ہوئے لوگ براہ راست خدا کو اپنا مرکز توجہ بنائیں۔ جزئی مسائل کو دین سمجھنے والے اساسی امور کو دین سمجھیں اور طلسماتی فضائل پر بھروسہ کرنے والے لوگ حقائق کی بنیاد پر اپنے دین کی تعمیر کریں۔ جن لوگوں نے بے روح عملیات کو دین کے ہم معنی سمجھ لیا ہے وہ زندہ دین کی لذتوں سے آشنا ہوں۔ جن کے یہاں دین ابھی تک چھنگلیا کی مانند ایک ضمیمہ بنا ہوا ہے وہ ان کی زندگیوں میں اس طرح داخل ہو کہ وہ ان کے کردار کے لئے قوت محرکہ بن جائے۔ جو لوگ کچھ مصنوعی اعمال کو دین داری سمجھے ہوئے ہیں وہ حقیقی دین داری کی فضا میں داخل ہوں۔

پھر اسی میں دور جدید کی اس سب سے بڑی خرابی کا حل بھی ہے جس نے اسلام کو تمام دنیا میں مسلمانوں کی قومی تحریکوں کا ضمیمہ بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ ساری دنیا میں غیر مسلم اقوام کی زد میں آگئے۔ اس کے بعد قدرتی طور پر یہ ہوا کہ مسلمانوں کو دوسری قومیں ظالموں اور غاصبوں کے روپ میں دکھائی دینے لگیں۔ ان کے اندر ہر جگہ مقابلہ آرائی کا ذہن ابھر آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اب وہی باتیں اپیل کرتی ہیں جن میں ان کی دفاعی نفسیات کو تسکین ملتی ہو۔ مثلاً اسلام کی عسکری تعبیر، انبیاء کے مشن کو حکومت وسیاست کی اصطلاحوں میں بیان کرنا، دوسری قوموں کو ظالم قرار دے کر ان کے خلاف ہنگامہ آرائی، مصالحت (Adjustment) کے بجائے ٹکراؤ اور لڑائی کی باتیں، وغیرہ۔ یہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب اگر خاموش تعمیر اور دعوت آخرت کی بات کی جائے تو اس کو لوگ اس نظر سے دیکھتے ہیں جیسے یہ کوئی سازش ہے جو ان کو اپنے دشمنوں کے محاذ سے ہٹا کر غیر متعلق چیزوں میں مصروف کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ دین کو اگر قومی نقشوں میں بننے والے ڈھانچہ سے الگ کر کے ابدی حقیقتوں کی بنیاد پر کھڑا کر دیا جائے تو اس قسم کے تمام خیالات اپنے آپ بے زمین ہو جائیں گے۔ اسلام کی قومی تشریحات کسی آدمی کو اسی وقت تک اپیل کرتی ہیں جب کہ اس کا فکر قومی حالات کے نقشہ میں اٹکا ہوا ہو۔ اگر وہ قومی حالات سے اوپر اٹھ کر خدا کی ابدی کائنات میں جینے لگے تو اس قسم کی تشریحات وتعبیرات خود بخود اس کے لئے

بے کشش ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ذہنی بیداری یا فکری انقلاب ہی آج ملت اسلامی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کسی حقیقی کام کا واحد آغاز یہ ہے کہ ملت کے افراد جو سماج روپی اسلام کی زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کو اس سے ہٹا کر دوبارہ کتاب روپی اسلام کی زمین پر کھڑا کیا جائے۔ اس کام کے قابل لحاظ حد تک انجام پانے کے بعد ہی ان کے اندر ربانی شعور اور الٰہی کردار پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ ابتدائی مقصود جب تک حاصل نہ ہو، کوئی بڑا اقدام کرنا یا تو غیر سنجیدہ انسان کا کام ہو سکتا ہے یا اس شخص کا جس کی عقل جاتی رہی ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری وہ تمام چیزیں جن کو ہم چاہتے ہیں وہ سب اسی فکری انقلاب کا ضمنی حاصل (By-product) ہیں۔ وہ سارے اہم ترین نتائج جن کے ہم منتظر ہیں وہ اسی ذہنی انقلاب کے بطن سے ظہور میں آتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب توہمات کی زنجیروں کو توڑتا ہے جس سے علمی ترقیاں وجود میں آتی ہیں۔ یہ فکری انقلاب افراد کے اندر حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے جس کے بعد وہ مختلف میدانوں میں بڑے بڑے کارنامے انجام دینے لگتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب لوگوں کے اندر آفاقیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ غیر مفتوح کردار کے مالک بن جاتے ہیں۔ یہ فکری انقلاب اپنے متاثر افراد کے اندر ربانی شعور ابھارتا ہے جس کے بعد وہ ایسی بے پناہ منصوبہ بندی کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جس کا توڑ کسی کے لئے ممکن نہ ہو۔ ذہنی انقلاب قوموں اور آبادیوں کو مسخر کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے ماننے والوں کا دبدبہ زمین پر قائم ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ ذہنی انقلاب جہاں برپا ہوتا ہے وہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے قدموں کے نیچے سے بھی رزق ابلتا ہے اور ان کے سروں کے اوپر بھی رزق برستا ہے۔ خدا اپنی دنیا بھی ان کے لئے لکھ دیتا ہے اور اپنی آخرت بھی۔

شریعتوں میں فرق کی حکمت

مذہبی جمود کو توڑنا اللہ تعالیٰ کو اتنا زیادہ مطلوب ہے کہ اس کے لئے اس نے ایک پیغمبر اور دوسرے پیغمبر کی شریعت میں فرق رکھا۔ مختلف پیغمبروں کا دین اگرچہ ایک تھا مگر ان کی شریعتوں میں باہم فرق رکھا گیا۔ اس فرق کی خاص حکمت یہی تھی۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریق عمل مقرر کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ مگر اس نے ایسا اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (المائدہ ۴۸) ہر امت کے لئے ہم نے ایک طریق عبادت مقرر کیا ہے جس کے وہ پیرو ہیں۔ پس وہ اس امر میں تم سے جھگڑا نہ کریں اور تم اپنے رب کی طرف

دعوت دو، یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو (الحج ۶۸) یہی بات تحویل قبلہ کے ذیل میں اس طرح فرمائی گئی ہے:
اور ہر ایک کے لئے ایک رخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے۔ پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو (البقرہ ۱۴۸)
اس سلسلہ میں مزید ارشاد ہوا ہے کہ جس قبلہ پر تم اب تک تھے اس کو ہم نے صرف یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹا پھر جاتا ہے (البقرہ ۱۴۳)

شریعتوں میں فرق کی توجیہہ عام طور پر ارتقار کی اصطلاحوں میں کی جاتی ہے۔ یعنی خدا کی شریعت سادہ اور غیر کامل صورت سے ترقی کرکے کامل صورت تک پہنچی ہے اور شریعتوں کا باہمی فرق اسی سبب سے ہے۔ مگر یہ توجیہہ سراسر بے بنیاد ہے۔ قرآن میں واضح طور پر تبدیلیٔ شریعت کا سبب ابتلار بتایا گیا ہے نہ کہ ارتقار۔

شریعت اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے دینی عقائد کا زندہ اظہار ہے۔ مگر ایک طریقہ پر نسل در نسل عمل کرتے کرتے ایسا ہوتا ہے کہ شریعت سے اس کی روح نکل جاتی ہے۔ وہ ایک ایسا خشک ڈھانچہ بن جاتی ہے جس سے آدمی کا نفسیاتی رشتہ ٹوٹ چکا ہو۔ اس وقت خدا شریعت کے قدیم ڈھانچہ کو بدل دیتا ہے تاکہ تقلیدی عمل کا خاتمہ ہو اور لوگ زندہ احساس اور تازہ فیصلہ کے تحت نئی شریعت کو اپنی زندگیوں میں اختیار کریں۔ اس وقت کھل جاتا ہے کہ کون شعور کے تحت خدا کی عبادت کر رہا تھا اور کون جمود اور تقلید کے تحت۔ بیت المقدس کے بجائے کعبہ کو قبلہ قرار دینا تبدیلیٔ شریعت کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی وجہ قرآن میں یہ بتائی گئی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول کا متبع ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے۔ یعنی اس بات کا امتحان کہ کون حقیقت کا پیرو ہے اور کون تقلیدی روایات کا۔ تقلیدی روایات کا پیرو اپنی مانوس عصبیتوں سے چمٹا رہے گا اور جو حقیقت کا پیرو ہے وہ تقلیدی عمل کو چھوڑ دے گا اور فوراً اصلی حکم پر قائم ہو جائے گا۔

اسلامی دعوت

جب بارش کا موسم آتا ہے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ کالے بادل فضا میں منڈلانا شروع کرتے ہیں تو خدا کا فرشتہ خاموش زبان میں یہ اعلان کرتا ہے کہ کون ہے جو اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا سارے کائناتی نظام کو اس کی موافقت میں جمع کردے اور اس کے بعد اس کے بیج کو سات سوگنا زیادہ فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ آج دین کا بھی ہے۔ خدا نے آج سارے اسباب دین کی موافقت پر جمع کردئے ہیں۔ سیکڑوں برس کی گردش کے بعد زمانہ نے فیصلہ کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ عین ہمارے حق میں ہے۔ اب ان امکانات کو بروئے کار لانے کے لئے ضرورت ہے کہ کچھ خدا کے بندے اٹھیں جو صرف خدا کے لئے اپنے آپ کو اس مشن میں دے دیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو اس مشن کے حوالے کریں گے ان کے لئے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ ان کے عمل کا سات سوگنا بلکہ اس سے بھی زیادہ انعام آخرت میں لوٹائے گا اور اسی کے ساتھ اگر اس نے چاہا تو موجودہ دنیا میں بھی۔

اسلامی تاریخ دو بڑے مرحلوں سے گزر چکی ہے اور اب اس کے تیسرے مرحلہ کا آغاز ہونا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں جن کو اس تیسرے مرحلہ کو شروع کرنے کی سعادت حاصل ہوگی۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ آج اس سے بڑا کوئی کام نہیں۔ آج اس سے بڑا کوئی میدان عمل نہیں جس میں قوت والے اپنی قوت لگائیں اور اس سے بڑی کوئی مد نہیں جس میں پیسہ والے اپنا پیسہ خرچ کریں۔

اسلام کیا ہے

اسلام ایک لفظ میں توحید کا نام ہے۔ جس طرح درخت اصلاً ایک بیج کا نام ہوتا ہے اسی طرح اسلام کی اصل حقیقت توحید ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی توحید کے مظاہر اور تقاضے۔ توحید بظاہر یہ ہے کہ خدا کئی نہیں ہیں بلکہ خدا ایک ہے۔ مگر یہ توحید کوئی خشک گنتی کا عقیدہ نہیں ہے جو کچھ مقرر الفاظ دہرا کر آدمی کو حاصل ہو جائے۔ یہ اپنی ذات کی نفی کی قیمت پر خدا کا اثبات ہے، یہ خدا کے مقابلہ میں اپنے آپ کو دریافت کرنا ہے۔ خدا قادر مطلق ہے اور بندہ عاجز مطلق۔ کوئی بندہ جب خدا کے ساتھ اپنی اس نسبت کو پالیتا ہے تو اسی کا نام توحید ہے۔

توحید یا ایک اللہ پر ایمان ایک شعوری فیصلہ ہے۔ یہ حق کا انکار کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے حق کو مان لینا ہے۔ اس اعتبار سے ایمان حقیقت واقعہ کے اعتراف کا دوسرا نام ہے۔ اور حقیقت واقعہ کا شعوری اعتراف بلاشبہ اس دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔

یہی توحید دنیا کی تمام چیزوں کا دین ہے۔ زمین اور سورج انتہائی کامل صورت میں خدا کی تابعداری

کر رہے ہیں۔ شہد کی مکھی کمال درجہ پابندی کے ساتھ خدا کی مقرر کی ہوئی راہوں پر چل رہی ہے۔ مگر ان میں سے کسی کی محکومی شعوری محکومی نہیں۔ وہ خود اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔ ساری کائنات میں یہ صرف انسان ہے جو ارادہ اور شعور کے ساتھ اپنے کو محکوم بناتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز کامل طور پر خدا کی فرماں برداری کر رہی ہے۔ مگر انسان کی فرماں برداری اختیاری ہے اور دوسری چیزوں کی فرمانبرداری بے اختیاری۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے زمین پر اپنا سر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں مگر انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے۔

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں شعوری اور اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعور قدرت کے مقابلہ میں شعور عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "عدد" کے مقابلہ میں "صفر" کا ہندسہ تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں۔ جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی نے پیش نہ کی تھی۔ اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنت کیا ہے

جنت ایک انتہائی حیرت انگیز دنیا ہے جو خدا نے اپنے خاص بندوں کے لئے بنائی ہے۔ وہاں خدا کی صفاتِ کمال اپنی پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ جنت کے بارے میں قرآن میں ہے کہ وہاں نہ حزن ہوگا اور نہ خوف۔ یہ ناقابل قیاس حد تک انوکھی صفت ہے۔ کیوں کہ دنیا میں ہم جانتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا دولت مند یا حکمراں اس پر قادر نہیں کہ وہ غموں اور اندیشوں سے خالی زندگی اپنے لئے حاصل کر لے۔ جنت کے بارے میں قرآن میں آیا ہے کہ وہاں ہر طرف "سلام سلام" کا چرچا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسے بلند انسانوں کی آبادی ہے جو ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہوں گے۔ ان کے دلوں میں دوسروں کے لئے سلامتی اور خیر خواہی کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ جنت کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ وہاں آدمی جو غذا کھائے گا اور جو مشروبات پئے گا وہ بول و براز کی شکل میں نہیں خارج ہوگا بلکہ ایک خوشبودار ہوا نکلے گی اور اس کے ذریعہ تمام کثافت خارج ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت ایسا لطیف مقام ہے جہاں غلاظت بھی بہ شکل خوشبو خارج

ہوتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جنت میں نیند نہیں ہوگی جب کہ وہاں آدمی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنت اتنی لذیذ جگہ ہے کہ آدمی ایک رات کی نیند کے بقدر بھی اس سے جدا ہونا پسند نہ کرے گا حالاں کہ وہ اس کے اندر کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک رہے گا۔ کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس اور کیسی عجیب ہوگی جنت کی زندگی۔ پھر ان سب سے بڑھ کر یہ کہ جنت وہ مقام ہے جہاں آدمی اپنے خدا کو دیکھ سکے گا۔ وہ خدا جو ہر قسم کی ناقابل قیاس خوبیوں کا مالک ہے۔ وہ خدا جس نے عدم سے وجود کو پیدا کیا۔ وہ خدا جو آسمان کی عظمتوں کا خالق ہے۔ وہ خدا جس نے سورج کو چمکایا۔ وہ خدا جو درختوں کی سرسبزی اور پھولوں کی مہک میں ظاہر ہوا۔ ایسا خدا کیسا عظیم اور کیسا حسین ہوگا اس کا تصوراتی قیاس بھی کسی کے لئے ممکن نہیں۔ جس جنت میں ایسا نفیس ماحول ہو، جہاں کائنات کے رب کا دیدار حاصل ہوتا ہو اس کی لذتوں اور راحتوں کو کون بیان کر سکتا ہے

مومنانہ زندگی

ایسی قیمتی جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی عام دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ اسلامی عملیات کا جوڑ لگائے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ اسلام ہاتھ کی چھنگلیا نہیں بلکہ وہ آدمی کا پورا ہاتھ ہے۔ جو شخص اسلام کو اپنی زندگی میں غیر موثر ضمیمہ بنا کر رکھے اس نے اسلام کی توہین کی۔ اسی طرح مومن ہونے کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ آدمی "خدائی فوجدار" بن کر کھڑا ہو جائے اور حکمرانوں کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کرنے کو اسلام کا کمال سمجھنے لگے۔ اس قسم کی چیزیں اسلام نہیں، وہ خود ساختہ سیاست کو اسلام کا نام دینا ہے۔ پہلی قسم کے لوگ اگر دین کی کم قدری کے مجرم ہیں تو دوسری قسم کے لوگ دین کی تحریف کے۔ اور یہ دونوں ہی چیزیں آدمی کو خدا کی ناراضگی کا مستحق بناتی ہیں نہ کہ خدا کے انعام کا۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہوا ہو۔ جو خدا کو اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ اور جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ

میں چھپا ہوا ہے۔ مؤمن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً آچکی ہوگی۔

اسلامی دعوت

آگ کا انگارہ جب خارج کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے تو اسی کو ہم آنچ کہتے ہیں۔ برف کا تودہ جب اپنے ماحول کو اپنی حقیقت سے متعارف کرتا ہے تو اسی کو ٹھنڈک کہا جاتا ہے۔ یہی معاملہ مومن کا بھی ہے۔ زمین پر کسی مومن کا وجود میں آنا خود ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اسلامی دعوت ضرور وجود میں آئے گی۔ کسی نفس انسانی میں جب وہ خدائی بھونچال آتا ہے جس کو اسلام کہا گیا ہے تو اس کے بعد لازمی نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے باہر کی دنیا اس سے باخبر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہی اسلامی دعوت کا آغاز ہے۔

اسلامی دعوت فرد انسانی میں انقلاب لانے کی دعوت ہے نہ کہ کسی قسم کے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ میں اکھیڑ پچھاڑ کرنے کی۔ اسلامی انقلاب اصلاً ایک نفسیاتی انقلاب ہے اور نفسیاتی انقلاب کسی نفس ہی کے اندر وقوع میں آسکتا ہے۔ نفس کا وجود صرف ایک فرد میں ہوتا ہے اس لئے اسلام کی گھٹنا بھی ایک فرد ہی میں گھٹتی ہے۔ قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کا اپنا کوئی نفسیاتی وجود نہیں۔ اس لئے قومی یا بین اقوامی ڈھانچہ کو اسلامی دعوت کا نشانہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے خالی فضا میں تیر مارنا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کسی گروہ کے قومی حالات یا کسی جغرافیہ کے تمدنی احوال لوگوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے درمیان ایک تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے اندر ان کے قومی یا سیاسی حالات کے نتیجہ میں کوئی حرکت اٹھ کھڑی ہو تو اس کا نام اسلامی تحریک نہیں ہو جائے گا۔ اگر مسلمان اپنے قومی دشمن سے تصادم کو جہاد کہیں یا اپنی قومی تعمیر کو اسلامی نظام کی اصطلاحوں میں بیان کریں تو یہ اسلام نہیں بلکہ غیر اسلام کو اسلام کا نام دینا ہے جو آدمی کو صرف سزا کا مستحق بناتا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر آدمی کو کوئی اسلامی انعام دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کی اسلامی تحریکیں عظیم الشان پیمانہ پر اٹھیں مگر عملاً وہ اس طرح بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں جیسے خدا کے نزدیک ان کی کوئی قیمت ہی نہ تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کے سب قومی ہنگامے ہیں اور کسی قوم کے قومی ہنگاموں کا نام اسلام نہیں

اسلامی دعوت کی تحریک ایک لفظ میں جنت کی طرف بلانے کی تحریک ہے۔ جنت خدا کی لطیف و نفیس دنیا ہے جہاں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو اخلاق خداوندی کی سطح پر جئے ہوں، جنھوں نے دنیوی تعلقات میں کمال انسانیت کا ثبوت دیا ہو، جو خدا کی ابدی دنیا سے اثر لے کر متحرک ہوئے ہوں نہ کہ سیاسی اور معاشی حالات کے اثر سے۔ آج کی دنیا میں اسی کا چناؤ ہو رہا ہے۔ جو لوگ اپنی نفسیات اور کردار کے اعتبار سے جنتی ماحول میں بسانے کے قابل

ٹھہریں گے ان کو چھانٹ کر جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد بقیہ تمام لوگ خدا کی رحمتوں سے محروم کر کے دور پھینک دئے جائیں گے تاکہ ابدی طور پر تاریکیوں کے غار میں بھٹکتے رہیں۔

انسان کے سوا بقیہ دنیا بے حد حسین ہے۔ ہرے بھرے درختوں اور نرم و نازک پھولوں کو دیکھئے، زمین و آسمان کے قدرتی مناظر کا معائنہ کیجئے۔ ان کی بے پناہ کشش آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے گی کہ ان سے نظر ہٹانے کا جی نہ چاہے گا۔ مگر اس کے مقابلہ میں انسانی دنیا ظلم اور گندگی کا کوڑا خانہ بنی ہوئی ہے۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی سطح پر خدا کی مرضی براہ راست اپنی پوری شکل میں نافذ ہے، یہ دنیا ویسی ہی ہے جیسا کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ ہو۔ اس کے برعکس انسان کو خدا نے آزادی دے دی ہے۔ اسی آزادی کے غلط استعمال نے انسانی دنیا کو جہنم کدہ بنا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام خوبیوں کا مالک صرف خدا ہے۔ خدا جہاں اپنے اختیار کو روک لے وہیں سے جہنم شروع ہو جاتی ہے اور خدا جب اپنے اختیار کو نافذ کر دے تو اسی کا نام جنت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خدا نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا کہ انسان کو آزادی دے دی کہ وہ خدا کی حسین دنیا کو اپنی باغیانہ کارروائیوں سے عذاب خانہ بنا دے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بغیر وہ قیمتی انسان چنے نہیں جا سکتے تھے جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔ خدا کی وسیع دنیا اپنی ان گنت چیزوں کے ساتھ مکمل طور پر خدا کی اطاعت گزار ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانی نظاموں تک کوئی چیز بھی نہیں جو خدا کی مرضی سے ادنیٰ انحراف کرتی ہو۔ تاہم یہ تمام چیزیں اس لئے محکوم ہیں کہ وہ بے اختیار ہیں۔ فرماں برداری کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے لئے ممکن نہیں۔ اب خدا کو ایسی باشعور اور حقیقت پسند مخلوق درکار تھی جو اختیار رکھتے ہوئے بے اختیار ہو جائے۔ جو کسی جبر کے بغیر خود اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو خدا کا محکوم بنالے۔ یہی وہ انتہائی نادر ہستیاں ہیں جن کو چھانٹنے کے لئے خدا کا یہ عظیم کارخانہ آباد کیا گیا ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے لے کر آج تک انسانی ذہن کو جو چیز سب سے زیادہ پریشان کرتی رہی ہے وہ انسان کی دنیا میں خرابی کا مسئلہ (Problem of Evil) ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں ساری انسانی تاریخ ظلم اور برائی کا رجسٹر معلوم ہوتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنی آزادی کا انتہائی ظالمانہ استعمال کرتا ہے۔ مگر اتنی بڑی برائی کو خدا نے صرف اس لئے گوارا کیا کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا تھا جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ افراد ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کی خاطر بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل

سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا محکوم بنالیں۔ جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلادیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا اونچا کریں۔ مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو پوری طرح یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت اور اپنے مفادات کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے ہر "اپنے" کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا اور صرف حق کا گنبد کھڑا کر کے انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی نادر روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتی تھیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت برداشت کی جائے ـــــ اسلامی دعوت کا مقصد ایسی ہی روحوں کو تلاش کرنا ہے

اسلامی انقلاب

دنیا میں سیاسی اور تمدنی انقلاب اسلامی دعوت کا براہ راست نشانہ نہیں۔ تاہم وہ اس کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ کسی معاشرہ میں جب قابل لحاظ تعداد ایسے افراد کی جمع ہو جائے جو اللہ کے لئے جینا اور اللہ کے لئے مرنا چاہتے ہوں تو قدرتی طور پر وقت کی سیاست اور تمدن پر انھیں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اسلامی سیاست یا اسلامی نظام نام ہے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آنے کا جو اللہ کے آگے اپنے کو بے نفس کر چکے ہوں۔ جنھوں نے اپنی "میں" کو خدا کے عظیم تر "میں" میں گم کر دیا ہو۔ جن کے جذبات و احساسات آخرت سے اتنا زیادہ متعلق ہو جائیں کہ دنیا میں ان کا کوئی حوصلہ باقی نہ رہے جو دوسرے کے دل کے درد کو اپنے سینہ میں محسوس کرتے ہوں۔ ایسے ہی افراد اسلامی نظام قائم کرتے ہیں اور ایسے افراد اسی وقت بنتے ہیں جب کہ ہر قسم کے دنیوی مقصد سے بلند ہو کر خالص آخرت کے لئے تحریک چلائی جائے۔ اس کے برعکس اگر نعروں اور جلسوں کے زور پر کوئی انقلاب برپا کیا جائے تو وہ انقلاب نہیں ایک ٹریونگ ہوگا جہاں اسلام کے نعرے تو بہت ہوں گے مگر اسلام کے عمل کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ ایسے لوگ حق کے تقاضوں کا نام لیں گے مگر عملاً اپنے گروہ کے تقاضوں کے سوا کوئی چیز ان کے سامنے نہ ہوگی۔ وہ انقلاب اسلامی کے ہنگامے برپا کریں گے مگر حقیقتہً ان کا مدعا یہ ہوگا کہ دوسروں کو تخت سے ہٹا کر خود اس پر قابض ہو جائیں۔ وہ انسانیت اور اخلاق کے نام پر جلسوں اور تقریروں کی دھوم مچائیں گے مگر اس کا مقصود صرف یہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عنوان پر اپنی قیادت کی شان قائم کریں۔ اسلامی انقلاب کی واحد لازمی شرط "بے میں" انسانوں کی فراہمی ہے اور موجودہ طرز کی تحریکوں سے سب سے کم جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ یہی ہے۔ بلکہ سیاسی اور قومی انداز کی یہ تحریکیں تو "میں" کی غذا ہیں نہ کہ "میں" کی نفسیات کو ختم کرنے والی ـــــ خارجی انقلاب کو نشانہ بنانے والی تحریک افراد کے اندر کردار نہیں پیدا کر سکتی۔ کردار ہمیشہ ذاتی محرک سے پیدا ہوتا ہے نہ کہ خارجی محرک سے۔

کوئی آدمی دوسرے کے لئے نہیں کماتا، اسی طرح کوئی آدمی بیرونی محرک کے لئے باکردار بھی نہیں بنتا۔ جو لوگ "نظام" کے نام پر افراد سے باکردار بننے کی اپیلیں کرتے ہیں وہ صرف اپنی سطحیت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسرے کے بارہ میں کمتر اندازہ کا۔

پیغمبر کا کام

اسلام کا مشن ایک ہی مشن ہے۔ اور وہ ہے توحید کا پیغام لوگوں تک پہنچانا۔ ایک ایک شخص کو موحّد بنانے کی کوشش کرنا۔ یہی قدیم ترین زمانہ سے تمام نبیوں کا مشن تھا۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام زمانوں میں توحید کی دعوت جان کی قربانی کی قیمت پر دینی ہوتی تھی۔ توحید کا پیغام لے کر اٹھنے والے آگ کے الاؤ میں ڈال دئے جاتے اور آروں سے چیر دئے جاتے۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں شرک کو فکری غلبہ کا مقام حاصل تھا۔ حتیٰ کہ سیاست کی بنیاد بھی شرک پر قائم تھی۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں کو یہ باور کرا کے ان کے اوپر حکومت کرتے تھے کہ وہ دیوتاؤں کی اولاد ہیں۔ ان کے اندر خدا حلول کر آیا ہے۔ اس لئے جب توحید کا داعی یہ آواز بلند کرتا کہ خدا صرف ایک ہے، کوئی اس کا شریک نہیں، تو قدیم زمانہ کے بادشاہوں کو یہ آواز براہ راست ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والی نظر آتی تھی۔ اس میں انھیں اپنی مشرکانہ سیاست کی تردید دکھائی دیتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے سیاسی مفاد کی بنا پر توحید کے داعیوں کے دشمن بن جاتے اور بے رحمی کے ساتھ ان کو کچل دیتے۔

اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اس صورت حال کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔ قرآن میں پیغمبر آخر الزماں اور آپ کے ساتھیوں کو سکھایا گیا کہ تم اس طرح دعا کرو: رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا (خدایا ہمارے اوپر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے کے لوگوں پر ڈالا تھا)۔ یہ دعا کے انداز میں اس خدائی فیصلہ کا اظہار تھا کہ خدا انسانی تاریخ میں ایک نیا انقلاب لانے والا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اقتدار کا رشتہ شرک سے ٹوٹ جائے گا۔ اب حکومت ایک خالص سیاسی معاملہ ہوگا نہ کہ اعتقادی معاملہ۔ یہی وہ خدائی منصوبہ تھا جس کی تکمیل کے لئے قرآن میں حکم دیا گیا: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله (انفال ۳۹) یعنی مشرکوں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ کی حالت باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کے معنی آزمائش کے ہیں۔ فَتَنَ فلاناً عن رأيه کے معنی ہیں رائے سے پھیر دینا۔ قرآن میں آیا ہے: موسیٰ کو اس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کسی نے نہ مانا، فرعون اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کے ڈر سے جن کو اندیشہ تھا کہ فرعون ان کو ستائے گا (یونس ۸۳) اس آیت میں ان یفتنہم کا لفظ ہے جو ستانے اور عذاب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ گویا فتنہ کے معنی تقریباً وہی ہیں جس کو انگریزی زبان میں Persecution کہتے ہیں۔ یعنی کوئی رائے یا عقیدہ رکھنے کی بنا پر کسی کو ستانا۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا فتنہ تھا جس کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ شرک کا فتنہ تھا۔ چنانچہ مفسرین نے ان آیات میں فتنہ کی تفسیر "شرک" سے کی ہے۔ تاہم یہاں فتنہ سے مراد مطلق شرک نہیں بلکہ شرک جارح ہے۔ کیونکہ شرک جب جارح ہو تبھی وہ روکنے والا بنتا ہے۔ حتیٰ لا تکون فتنۃ کا مطلب ہے حتی لا یُفتَنَ رجلٌ عن دینہ۔ یعنی شرکِ جارح سے لڑکر اسے ختم کر دو تاکہ دین شرک بے زور اور مغلوب ہو کر رہ جائے اور غالب دین کی حیثیت سے صرف دینِ توحید دنیا میں باقی رہے۔

شرک اپنی ابتدائی صورت میں محض ایک عقیدہ ہے۔ مگر قدیم زمانہ میں اس نے "فتنہ" کا مقام حاصل کرلیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ میں انسانی فکر پر شرک کا غلبہ تھا۔ زندگی کے ہر معاملہ کو شرک کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سیاست وحکومت کی بنیاد بھی شرک کے اوپر قائم تھی۔ لوگ سورج اور چاند جیسی چیزوں کو دیوتا سمجھتے تھے اور شاہی خاندان اپنے آپ کو ان دیوتاؤں کی اولاد بتاکر لوگوں کے اوپر حکومت کرتا تھا۔ اس بنا پر جب توحید کا داعی یہ کہتا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو قدیم بادشاہوں کو یہ نظریہ ان کے حق حکمرانی کی تردید کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ اس کو اپنا حریف سمجھ کر اس کو مٹانے کے درپے ہوجاتے۔ عرب میں اور اطرافِ عرب میں توحید کی بنیاد پر جو اسلامی انقلاب آیا اس نے شرک کو فکری غلبہ کے مقام سے ہٹا دیا۔ اب شرک کی حیثیت ایک ذاتی عقیدہ کی ہوگئی نہ کہ ایک ایسے عوامی نظریہ کی جس کے اوپر سماجی زندگی کا پورا نظام قائم ہو۔ نتیجۃً شرک کا رشتہ اقتدار سے ٹوٹ گیا۔ کیونکہ اب شرک کی بنیاد پر کسی کے لئے حق حکمرانی کا دعویٰ کرنے کا موقع باقی نہیں رہا تھا۔

معلوم انسانی تاریخ میں یہ تبدیلی بالکل پہلی بار آئی۔ اس کے ہمہ گیر اثرات میں سے دو چیزیں یہاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ جب یہ معلوم ہوا کہ خدا صرف ایک ہے اور بقیہ تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں تو اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر مظاہر فطرت کے تقدس کا ذہن ختم ہوگیا۔ وہ چیزیں جو اب تک انسان کے لئے پرستش کا عنوان بنی ہوئی تھیں۔ وہ اس کو اپنی خادم نظر آنے لگیں (خلق لکم ما فی الارض جمیعا، بقرہ ۲۹) اب آدمی نے چاہا کہ وہ ان چیزوں کو جانے اور ان کو استعمال کرے۔ انسانی ذہن کی یہی وہ تبدیلی ہے جس نے تاریخ میں توہماتی دور کو ختم کرکے سائنس کے دور کو شروع کیا۔ اسی کے ساتھ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہت کا دور کم از کم نظریاتی طور پر ختم ہوگیا اور عوامی حکمرانی کے دور کا آغاز ہوا۔ جب یہ معلوم ہوگیا کہ تمام انسان یکساں ہیں، کسی انسان کے اندر کوئی خدائی صفت نہیں تو اس کے بعد بالکل قدرتی طور پر خدائی حق حکمرانی کے لئے زمین باقی نہیں رہی۔

ان دونوں انقلابات کا آغاز مدینہ سے ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتا ہوا

قدیم آباد دنیا کے بڑے حصہ میں پھیل گیا۔ اس مدت میں قدیم حالات کے اثر سے اس فکری تحریک کو بار بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم اس کا سفر جاری رہا۔ مخالف طاقتوں کی کوئی بھی کوشش اس میں کامیاب نہ ہو سکی کہ وہ مظاہر فطرت کے تقدس کے دور کو دوبارہ اس کی سابقہ عظمت کے ساتھ واپس لاسکے۔ اور نہ کسی حکمراں کے لئے کبھی یہ ممکن ہوا کہ وہ اس طرح مقدس بادشاہ ہونے کا مقام حاصل کرے جیسا کہ عراق کے نمرود اور مصر کے فرعون کو قدیم زمانہ میں حاصل تھا۔

مسلم دنیا سے مغربی دنیا کی طرف

ابتداءً تقریباً ایک ہزار سال تک یہ عمل مسلم دنیا میں ہوتا رہا۔ مگر سولھویں صدی عیسوی میں ایک نیا انقلاب آیا۔ مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کی وجہ سے ایک طرف بغداد کی عباسی خلافت ٹوٹ گئی اور دوسری طرف اسی باہمی اختلاف کے نتیجہ میں اسپین کا مسلم اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مسلم دنیا میں کوئی ادارہ ان لوگوں کی سرپرستی کرنے والا نہ رہا جو علمی و فکری تحقیق کا کام کر رہے تھے۔ چنانچہ علماء اور مفکرین کی بڑی تعداد دھیرے دھیرے اٹلی اور فرانس کی طرف منتقل ہو گئی۔ مخصوص اسباب کی بنا پر یورپ میں ان لوگوں کو بہت پذیرائی ملی۔ انقلابی عمل جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا، وہ یورپ کی دنیا میں ہونے لگا۔ تاہم یورپ پہنچ کر اس کے اندر ایک تبدیلی آگئی۔ مسلم دنیا میں یہ کام اسلام کے زیر اثر ہو رہا تھا، یورپ کو اسلام سے دلچسپی نہ تھی، اس نے اس کو اسلام سے جدا کر کے خالص علمی حیثیت سے فروغ دینا شروع کیا۔ اگرچہ مسلم علوم اور عربی زبان کی اس منتقلی کا اثر یورپ کے مسیحی عقائد پر بھی پڑا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر (۱۵۴۶-۱۴۸۳) براہ راست طور پر یورپ کے اوپر اسلامی اثرات کی پیداوار تھا۔ تاہم علمی و فکری تحریک کا ارتقاء یورپ میں آزاد سیکولر شعبہ کے طور پر ہوا نہ کہ مذہب کے ایک ذیلی شعبہ کے طور پر۔ جدید مغرب کا سائنسی اور جمہوری انقلاب تمام تر اسلامی انقلاب کی دین ہے۔ البتہ مغرب نے اس کو مذہب سے جدا کر کے سیکولر شکل دے دی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید مغربی انقلاب، اسلامی انقلاب کی ایک دنیوی صورت ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے ایٹم بم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت کی فوجی صورت ہے اور قومی ملکیت مارکسی نظریہ کی معاشی صورت۔

جدید انقلاب کی اسلامی اہمیت

جدید مغربی انقلاب، اپنی عمومی حیثیت میں، خود اسلام کا پیدا کردہ تھا۔ اس کے نتائج اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم تھے۔ اس انقلاب نے دنیوی اعتبار سے اس دعا کی تکمیل کر دی تھی جس کو خدا نے ان الفاظ میں ہمیں تلقین کیا تھا: اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پچھلے لوگوں پر ڈالا (بقرہ) اس انقلاب کے نتیجہ میں زندگی کے نظام میں ہمارے موافق جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خاص طور پر یہ تھیں:

۱۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں میں یہ عقیدہ بٹھاکر حکومت کرتے تھے کہ وہ سورج دیوتا یا چاند دیوتا کی اولاد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانہ میں توحید کی دعوت فوراً سیاسی اقتدار کی حریف بن جاتی تھی اور مشرک بادشاہوں کے ظلم کا نشانہ بنتی تھی۔ شرک کی تردید کو وہ اپنے حق حکمرانی کی تردید کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ اسلامی انقلاب کی تکمیل کے طور پر یورپ میں جو جمہوری انقلاب آیا ہے اس نے اس نزاکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا کیونکہ آج کا حکمراں عوامی رائے سے حکمرانی کا حق حاصل کرتا ہے نہ کہ خدا کے ساتھ اپنا مفروضہ الوہی رشتہ جوڑ کر۔ اس تبدیلی نے تاریخ میں پہلی بار یہ امکان کھول دیا کہ توحید کی تبلیغ اس اندیشہ کے بغیر کی جائے کہ پہلے ہی مرحلہ میں غیر ضروری طور پر اس کا ٹکراؤ سیاسی ادارہ سے ہو جائے اور وہ اس کو کچل کر رکھ دے، جیسا کہ اسلام سے پہلے ساری تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

۲۔ قدیم زمانہ میں مظاہر فطرت (سورج، چاند، دریا وغیرہ) کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ توحید کی بنیاد پر ہونے والے اسلامی انقلاب اور اس کے زیر اثر پیدا ہونے والے مغرب کے سائنسی انقلاب کے بعد یہ ہوا کہ فطرت کے واقعات خدائی مظاہر کے بجائے عام مادی مظاہر سمجھے جانے لگے۔ جو چیز پہلے پوجنے کی چیز سمجھی جاتی تھی وہ اب تحقیق و تجسس کی چیز بن گئی۔ اس کے نتیجہ میں جدید سائنسی اور تکنکی انقلاب پیدا ہوا جس نے بے شمار نئی طاقتیں انسان کے قبضہ میں دے دیں۔ اس انقلاب کے ذریعہ تیز رفتار سواریاں وجود میں آئیں اور جدید ذرائع ابلاغ (پریس، ریڈیو وغیرہ) تک انسان کی دسترس ہوئی۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار یہ ممکن ہو گیا کہ کسی عقیدہ کی تبلیغ عالمی اور بین اقوامی سطح پر کی جا سکے۔ خدا کے دین کی دعوت مقامی دعوت کے مرحلہ سے گزر کر عالمی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گئی۔

۳۔ اسی انقلاب کے ذریعہ کائنات کے وہ چھپے ہوئے حقائق سامنے آئے جو توحید اور اس سے متعلق نظریات کے حق میں اعلیٰ علمی دلائل فراہم کر رہے ہیں۔ جنھوں نے قرآن کے کائناتی اشاروں کو کھول کر ہر ایک کے لئے انھیں قابل فہم بنا دیا ہے۔ اس طرح تاریخ میں پہلی بار وہ دور آیا جب کہ کائناتی نشانیاں معجزہ کا بدل بن جائیں۔ دینی حقیقتوں کو مشاہداتی دلائل کی سطح پر ثابت کیا جا سکے۔

۴۔ پھر اسی انقلاب کے ذریعہ تاریخ میں پہلی بار معاملات پر غور و فکر کا سائنسی، بالفاظ دیگر، واقعاتی نقطۂ نظر پیدا ہوا۔ کائنات کا علم صرف اسی وقت حاصل ہو سکتا تھا جب کہ انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں اس پر غور کیا جائے۔ اس لئے اس کے اثر سے علمی دنیا میں یہی عام ذہن بن گیا۔ اب واقعات کو واقعات کی رو سے دیکھا جانے لگا نہ کہ خوش عقیدگی یا توہمات کے اعتبار سے۔ اب یہ فضا پیدا ہوئی کہ مذاہب کی خالص علمی اور تاریخی تحقیق کی جائے۔ اسی انداز مطالعہ کا یہ نتیجہ تھا کہ موجودہ زمانہ میں علمی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام کے سوا جتنے

مذاہب ہیں سب کے سب غیر تاریخی (اور اس بنا پر ناقابل اعتبار) ہیں۔ مذاہب کے درمیان جس مذہب کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے وہ صرف اسلام ہے (ملاحظہ ہو دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس)

مغرب کا غلبہ مسلم دنیا پر

مسلم دنیا نے صلیبی جنگوں (۱۲۷۱۔ ۱۰۹۵) میں مسیحی یورپ پر فتح پائی تھی۔ مگر اس فتح کے بعد ہی برعکس عمل بھی شروع ہو گیا۔ مسیحی یورپ نے محسوس کیا کہ اس کی شکست کا سبب علمی اور فکری میدان میں مسلم دنیا سے اس کا پیچھے ہونا تھا۔ چنانچہ صلیبی جنگوں کے بعد یورپ نے تیزی سے مسلمانوں کے علوم اور عربی زبان کو سیکھنا شروع کر دیا۔ بعد کی صدیوں میں جب مسلم دنیا کے اہل علم یورپ کے ملکوں میں منتقل ہوئے تو وہاں یہ عمل اور تیزی سے جاری ہو گیا۔ بالآخر مغرب کی ترقی اس نوبت کو پہنچی کہ وہ علم و عمل کے تمام شعبوں میں مسلم قوموں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس نے مسلم ممالک میں داخل ہونا شروع کیا اور انیسویں صدی تک یہ حال ہوا کہ تقریباً تمام مسلم دنیا پر مغربی قوموں کا تسلط قائم ہو گیا۔

یہی سیاسی حادثہ اس بات کا سبب بن گیا کہ مذکورہ قیمتی امکانات اسلامی دعوت کے حق میں استعمال نہ ہو سکیں۔ صلیبی جنگوں میں ہاری ہوئی قوموں کو دوبارہ مسلم علاقوں میں گھستے ہوئے دیکھ کر لوگ بھڑ اٹھے۔ ساری مسلم دنیا میں مغرب کے خلاف سیاسی زور آزمائی شروع ہو گئی۔ حتیٰ کہ بہت سے لوگ سیاسی مقابلہ آرائی ہی کو عین اسلام ثابت کرنے لگے تاکہ لوگ جب اجنبی حکمرانوں سے لڑ کر فارغ ہوں تو خود اپنے ملکی حکمرانوں کے خلاف مقدس سیاسی جہاد چھیڑ دیں۔ اس فضا میں کسی کو یہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا کہ جدید دنیا نے کچھ نئے امکانات کھولے ہیں اور وہ اسلام کے حق میں کامیابی کے ساتھ استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جدید مواقع انتظار کرتے رہے کہ ہم ان کو استعمال کر کے اسلام کی دعوت کو سارے عالم میں پھیلا دیں اور نتیجۃً خدا کی نصرت کے مستحق ہوں۔ مگر ہماری سیاسی نفسیات نے ہم کو اُدھر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ دی۔

سیاسی انقلاب کی نوعیت

سیاسی انقلاب کی اہمیت اسلام میں کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سیاسی انقلاب دراصل اس کا نام ہے کہ اہل حق کو اہلِ باطل پر غلبہ حاصل ہو جائے (الصف) قرآن کی صراحت کے مطابق یہ غلبہ خدا کی توفیق اور نصرت سے حاصل ہوتا ہے (وما النصر الا من عند اللہ) اور خدا کی نصرت کا استحقاق حاصل کرنے کی واحد لازمی شرط دعوت ہے۔ اہل حق جب دعوت کے عمل کو اس کی تمام صالح شرائط کے ساتھ شروع کریں اور اس کو کرتے ہوئے اتمام حجت کے قریب پہنچا دیں تو اس وقت اس دعوتی عمل کی تکمیل کے نتیجہ میں ایک طرف اہلِ حق انعام کے مستحق ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف اہل باطل سزا کے مستحق۔ اس وقت خدائی منصوبہ کے تحت حالات میں تبدیلی

شروع ہوجاتی ہے۔ اہل حق خدائی طاقت سے مسلح ہوکر اہلِ باطل پر غالب آتے ہیں۔ دعوت حق اور اتمام حجت کے بغیر محض سیاسی کارروائیوں سے کبھی کسی مسلم گروہ کو غیر مسلم طاقتوں پر غلبہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ خدا کی سنت ہے اور خدا کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی (انعام ۱۳۱)

غیر مسلم اقوام کے لئے غلبہ کا فیصلہ خدا کے عام قانونِ امتحان کے تحت ہوتا ہے (یونس ۱۴) مگر اہل ایمان کے لئے غلبہ کا فیصلہ قانون اتمام حجت کے تحت ہوتا ہے۔ اگر ہم غیر مسلم گروہ پر دعوتی عمل کو انجام نہ دیں تو ہم کو یہ امید بھی نہ کرنی چاہیے کہ غیر مسلم گروہ پر ہمیں غلبہ عطا کیا جائے گا۔ دعوتی عمل ہی تو غیر مسلم گروہ پر غلبہ کی قیمت ہے۔ پھر جب قیمت ادا نہ کی گئی ہو تو متاع مطلوب آخر کس طرح حاصل ہوگی۔

مسلم دنیا میں سیاسی ردعمل

چودھویں صدی ہجری کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ انیسویں صدی عیسوی کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ اس اعتبار سے چودھویں صدی ہجری اسلامی تاریخ کی اہم ترین صدی تھی۔ کیوں کہ یہ اس وقت آئی جب کہ اسلامی انقلاب کے بعد شروع ہونے والا عمل اپنی آخری تکمیل کے مرحلہ تک پہنچ گیا تھا۔ خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جس عالمی ہدایت کا دروازہ کھولا تھا، اس کو بر روئے کار لانے کے حالات اور ضروری وسائل اپنی کامل صورت میں مہیا ہوکر ہمارے سامنے آچکے تھے۔ مگر تاریخ کا غالباً یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ یہ دروازہ عین اس وقت خود مسلمانوں کے ہاتھوں بند ہوگیا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں کھولا تھا۔

جدید انقلاب نے یورپ کو جو طاقتیں دی تھیں ان کو اس نے اسی طرح اپنے قومی عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جس طرح کوئی بھی قوم ان حالات میں کرتی ہے۔ مغربی قوموں کی دسترس جیسے ہی جدید طاقتوں پر ہوئی ان کے یہاں وہ چیز وجود میں آئی جس کو مغربی استعمار کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے جغرافیہ سے نکل کر خشکی اور تری میں اپنے جھنڈے گاڑے۔ قوموں کے درمیان اپنی تہذیب پھیلائی۔ جن لوگوں نے ان کے راستہ میں رکاوٹ ڈالی ان کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ مغربی قوموں کے ان عزائم کا براہ راست شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے باہر اکثر آباد دنیا مسلمانوں ہی کے زیر اقتدار تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز جس کو ہم نے اسلامی انقلاب کا سیکولر نتیجہ کہا ہے، اس کا تعارف مسلمانوں سے اپنے پہلے ہی مرحلہ میں اس حیثیت سے ہوا گویا کہ وہ ایک دشمن طاقت ہے جو مسلمانوں کو ان کی تمام عظمتوں سے محروم کرکے ان کو ایک مغلوب اور پسماندہ قوم بنا دینا چاہتی ہے۔ مغربی انقلاب کا افادی پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا، وہ اس کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حریف کی حیثیت سے دیکھنے لگے۔

چودھویں صدی ہجری اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی صدی تھی جب کہ یہ امکان پیدا ہوا تھا کہ اسلام

کی دعوت توحید کو یُسر (آسانی) کے حالات میں انجام دیا جائے جب کہ اس سے پہلے صرف عُسر (سختی) کے حالات ہی میں اس کو انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ واقعہ بھی پہلی بار ہوا کہ خود انسان کے اپنے مسلّمات کے مطابق اسلام کا دیگر ادیان کے مقابلہ میں واحد معتبر دین ہونا ثابت کیا جائے اور اس کو اعلیٰ ترین علمی شواہد سے اس طرح مدلّل کر دیا جائے کہ کسی کے لئے انکار کی جرأت باقی نہ رہے۔ نیز اس صدی میں پہلی بار تیز رفتار سواریاں اور تبلیغ کے جدید ذرائع انسان کے قبضہ میں آئے جن سے کام لے کر اسلام کے پیغام کو بین اقوامی سطح پر پھیلایا جا سکتا تھا۔ مگر جو قومیں ان خدائی برکتوں کو ہماری طرف لا رہی تھیں وہ اتفاقی حالات کے نتیجہ میں ہماری سیاسی حریف بن گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ساری مسلم دنیا مغرب کے بارے میں مخالفانہ نفسیات کا شکار ہو گئی، مغرب کی طرف سے آنے والے انقلاب کا افادی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حالاں کہ خدا نے مسلمانوں کے لئے ایسا امکان کھولا تھا کہ وہ خود مغرب کے پیدا کردہ حالات کو اپنے دعوتی مقاصد میں استعمال کر کے مغرب کو نظریاتی طور پر فتح کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں نے بروقت اس دانش مندی کا ثبوت دیا ہوتا تو چودھویں صدی ہجری میں وہ واقعہ دوبارہ نئے انداز سے پیش آتا جو آٹھویں صدی ہجری میں تاتاری فاتحین کے خادمان اسلام بن جانے کی صورت میں پیش آچکا ہے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکیں

چودھویں صدی ہجری میں ساری مسلم دنیا میں بے شمار اسلامی تحریکیں اٹھیں۔ مگر ضمنی فرق کے باوجود یہ تمام تحریکیں ردعمل کی تحریکیں تھیں نہ کہ حقیقی معنوں میں مثبت تحریکیں۔ جدید مسلم قیادت "مغرب" کے نام سے جس چیز سے واقف ہوئی وہ صرف یہ تھا کہ یہ ایک حملہ آور قوم ہے جو ہمارے لئے سیاسی چیلنج بن کر اٹھی ہے، وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ مغرب دراصل کچھ جدید قوتوں کی دریافت کا نام ہے اور یہ قوتیں اسلام کے لئے عین مفید ہیں بلکہ بالواسطہ طور پر خود اسلامی انقلاب کی پیدا کردہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسلم تحریکیں نئے امکانات سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، وہ جدید قوموں کے مقابلہ میں صرف ایک منفی رول ادا کر کے رہ گئیں۔

اس صورت حال کا مزید نقصان یہ ہوا کہ دوسری قوموں سے ہمارا صحیح اسلامی رشتہ قائم نہ ہو سکا۔ مسلمان کے لئے دوسری قومیں مدعو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر مذکورہ منفی نفسیات کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہم نے ان قوموں کو مدعو نہ سمجھا، ان کو صرف حریف کی نظر سے دیکھا۔ اسلامی تحریکیں پیغام آخرت کی تحریکیں نہ رہیں بلکہ پیغام سیاست کی تحریکیں بن گئیں۔ ان تحریکوں نے انداز کے فرق کے ساتھ، جدید دنیا کو جس "اسلام" سے واقف کرایا وہ محض ایک قسم کا قومی اسلام تھا نہ کہ خدا کا وہ دین جو انسانوں کو آخرت کی ابدی کامیابی کا راستہ دکھانے کے لئے آیا ہے۔ داعی اور مدعو کا تعلق حریف اور مدمقابل کا تعلق بن کر رہ گیا۔

یہ مسلم تحریکیں اپنی جس معذوری کی وجہ سے "مغرب بحیثیت استعمار" اور "مغرب بحیثیت جدید قوت" کو الگ الگ کر کے نہ دیکھ سکیں، اسی معذوری کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ انھوں نے جدید قوموں کے خلاف اپنی مہم میں نہ تو نئی قوتیں فراہم کیں اور نہ نئے حالات کی رعایت کی۔ حد درجہ نادانی کے ساتھ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جان و مال کی قربانیاں دی جاتی رہیں جب کہ ان قربانیوں کے لئے قطعی طور پر مقدر تھا کہ اسباب کی اس دنیا میں وہ بالکل رائگاں ہو کر رہ جائیں۔ اس طویل غیر حقیقت پسندانہ سیاست کی اب یہ نفسیاتی قیمت مسلمانوں کو دینی پڑ رہی ہے کہ پوری کی پوری مسلم دنیا ایک قسم کے فرضی جنونِ عظمت (Paranoia) کا شکار ہو کر رہ گئی ہے اور اب کوئی حقیقت پسندانہ بات اسے اپیل ہی نہیں کرتی۔

فخر نہیں ذمہ داری

پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے یکم اکتوبر ۱۹۸۰ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک تقریر کی۔ ان کی ڈیڑھ گھنٹہ کی یہ تقریر ان کے اپنے الفاظ میں دنیا بھر کے ۹۰ کرور مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ ان کی لکھی ہوئی تقریر کا ایک پیراگراف یہ تھا:

> As they enter the 15th Century Hijra, the Islamic peoples, who have rediscovered their pride in their religion, their great culture and their unique social and economic institutions, are confident that the advent of this century would mark the beginning of a new epoch, when their high ideals of peace, justice, equality of man, and their unique understanding of the universe, would once again enable them to make a worthy contribution to the betterment of mankind.

اب کہ اسلامی قومیں پندرھویں صدی ہجری میں داخل ہو رہی ہیں، انھوں نے اپنے مذہب، اپنے عظیم کلچر اور اپنے بے مثل سماجی اور معاشی اداروں میں اپنے فخر کو دوبارہ دریافت کر لیا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ اس صدی کا آغاز ایک نئے عہد کی ابتدا ثابت ہوگا جب کہ امن، انصاف، انسانی برابری اور کائنات کے بارے میں ان کا بے مثل شعور ان کو دوبارہ اس قابل بنائے گا کہ وہ انسانیت کی بھلائی میں قابل قدر حصہ ادا کر سکیں۔

جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بات موجودہ مسلمانوں کی تعریف کے طور پر کہی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی میں مسلمانوں کا وہ المیہ بھی چھپا ہوا ہے جس نے موجودہ زمانہ میں ان کی تمام اسلامی کوششوں کو بے قیمت بنا دیا ہے۔ آج ساری مسلم دنیا میں اسلام کے نام پر زبردست سرگرمیاں جاری ہیں مگر یہ ساری دھوم فخر (Pride) کے طور پر ہے نہ کہ ذمہ داری کے طور پر۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سرگرمی فخر کے احساس کی بنیاد پر اٹھتی ہے (حدید ۲۰) اور اخروی سرگرمی عبدیت کے احساس کی بنیاد پر (ذاریات ۵۶) فخر سے انانیت اور مطالبہ کا جذبہ ابھرتا ہے اور عبدیت سے عجز اور ذمہ داری کا۔ اسلامی تحریک وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کے لئے اٹھے۔ مگر موجودہ زمانہ کی

اسلامی تحریکیں دنیا میں بڑائی حاصل کرنے کے جذبہ سے اٹھی ہیں۔ قومی سربلندی کے احساس نے ان کو کھڑا کیا ہے۔ آج کے مسلمانوں کے لئے اسلام ایک ناز کی چیز ہے نہ کہ حقیقۃً آخرت کی صراط مستقیم۔ یہ واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ تحریکیں مسلمانوں کی قومی تحریکیں ہیں نہ کہ حقیقی معنوں میں اسلامی تحریکیں۔ مسلمانوں کے یہاں آج جس مذہب کی دھوم ہے وہ قومی مذہب ہے نہ کہ خدائی مذہب۔ کیونکہ قومی مذہب سے ہمیشہ فخر کی نفسیات ابھرتی ہے اور خدائی مذہب سے ذمہ داری کی نفسیات۔

حقیقی اسلام آدمی کے اندر عجز اور تواضع پیدا کرتا ہے اور جہاں عجز اور تواضع ہو وہاں گویا ساری بھلائیاں جمع ہو گئیں۔ کیونکہ ہر خرابی کی جڑ کبر اور ہر اچھائی کی جڑ عجز ہے۔ ایسے افراد میں ان کے اسلام کے لازمی نتیجہ کے طور پر خدا کا خوف، آخرت کی طلب، باہمی اتحاد، ایک دوسرے کی خیر خواہی، شکایتوں سے درگزر کرنا، تعمیری کاموں کی طرف توجہ اور حقوق کے مقابلہ میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس جاگ اٹھتا ہے۔ اور جس سماج میں ایسی نفسیات والے انسان قابل لحاظ تعداد میں پیدا ہو جائیں وہ اپنے آپ دنیا میں سب سے اونچا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ اس کے برعکس قومی اسلام آدمی کے اندر فخر و ناز کی نفسیات پیدا کرتا ہے اور جہاں فخر و ناز کے جذبات ہوں وہاں گویا تمام برائیاں جمع ہو گئیں۔ ایسے افراد کے اندر انانیت، آخرت سے بے خوفی، اپنی غلطیوں کو دیکھنے کے بجائے دوسروں کا احتساب اور پھر ان کیفیات کے نتیجہ میں اختلاف اور باہمی ٹکراؤ عام ہو جاتا ہے۔ وہ خاموش تعمیری کام کے مقابلہ میں نمائشی کاموں کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ وہ پیچھے چلنے کے بجائے ہمیشہ آگے چلنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ وہ اپنے معمولی کام کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کرتے ہیں تاکہ اپنے برتری کے جذبہ کو تسکین دے سکیں۔ اسلام ایسے لوگوں کے درمیان کرنے سے زیادہ کہنے کی چیز ہوتا ہے۔ اور جہاں ایسا اسلام ہو وہاں لوگوں کے اوپر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے نہ کہ خدا کی رحمت و نصرت۔

یہودیوں کی صہیونی تحریک قدیم اسرائیلی عظمت کو واپس لانے کی تحریک ہے۔ ہندوؤں کی آر ایس ایس تنظیم اپنے شان دار ماضی کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اٹھی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی ایک پر فخر دنیوی تاریخ ہے اور موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکیں کسی نہ کسی اعتبار سے اسی پر فخر ماضی کو واپس لانے کے جذبہ سے ابھری ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہودیوں اور ہندوؤں کی تحریکیں مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے کے باوجود حقیقی معنوں میں مذہبی تحریکیں نہیں ہیں، وہ یقینی طور پر صرف قومی تحریکیں ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کی اسی قسم کے جذبات کے تحت اٹھنے والی تحریکیں بھی محض اس لئے اسلامی تحریکیں نہیں بن جائیں گی کہ وہ اپنے مقصد کو اسلامی الفاظ میں بیان کرتی ہیں۔ خدا کسی کے عمل کو حقیقت کے اعتبار سے دیکھتا ہے نہ کہ ظاہر کے اعتبار سے۔ جو تحریک قومی نفسیات کے ساتھ اٹھے وہ خدا کی نظر میں قومی تحریک ہی رہے گی، اس کا قرآن و حدیث کے الفاظ استعمال کرنا کسی بھی طرح اس کو اسلامی

تحریک کا مقام نہیں دے سکتا۔ اور نہ اس پر خدا کے وہ وعدے پورے ہو سکتے جو صرف حقیقی اسلامی تحریک کے لئے مقدر ہیں۔

ایک حقیقی درخت خود اپنے بیج سے اگتا ہے نہ کہ پلاسٹک کے ہم شکل بیج سے۔ اسی طرح وہی اسلامی تحریک خدا کے وعدہ کئے ہوئے نتائج تک پہنچتی ہے جو حقیقی اسلامی بنیادوں پر اٹھی ہو۔ ایک تحریک جو حقیقتاً قومی محرکات کے تحت اٹھے وہ صرف اس لئے اسلامی نتائج ظاہر نہیں کرنے لگے گی کہ اس کے رہنما جب اس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں تو وہ اس کو اسلامی الفاظ اور اسلامی اصطلات میں بیان کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک دراصل معرفت خداوندی کا عملی اظہار ہے۔ وہ آخرت کے نظام کو دنیا کی زندگی میں اتار لانا ہے۔ خدا نے بقیہ کائنات میں جن اخلاقیات کو بزور قائم کر رکھا ہے انھیں اخلاقیات کو انسان کی سطح پر خود اپنے ارادے سے قائم کرنا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اسلامی تحریک ایک ابدی حقیقت کے زیر اثر اٹھنے والی تحریک ہے نہ کہ ایسی تحریک جو قومی واقعات کے وقتی ردعمل کے طور پر ظہور میں آئی ہو۔

مومن خدا کی زمین میں اُگنے والا خدا کا سرسبز درخت ہے۔ اور مومنین کی جماعت خدا کا سرسبز باغ۔ جو لوگ وقتی تماشوں یا قومی ہنگاموں کو اسلامی دعوت کا نام دیتے ہیں وہ گویا اپنے ٹھنٹھ کو خدا کا سرسبز باغ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ خدا کے نام پر استغلال کرنے کے مجرم ہیں، وہ اپنے اس عمل کے لئے کسی کریڈٹ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

غلبۂ اسلام

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا سوال آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں سب سے زیادہ ابھرا ہوا سوال ہے۔ مگر اس سلسلے میں ان کی کوششوں کو دیکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض اسباب سے ان کے اندر عظمت ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی ایک مجہول خواہش تو ضرور پیدا ہوگئی ہے مگر ماضی کی تاریخ کو حال کا واقعہ بنانے کے لئے جو ضروری عمل درکار ہے اس کا واضح شعور انھیں حاصل نہیں۔

ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کو فضائل اسلام کی طلسماتی کہانیاں سنا کر مسجدوں کی آبادی میں اضافہ کرو، اور اس کے بعد ساری دنیا اپنے آپ تمھاری ہو جائے گی۔ مگر یہ حل ایسا ہی ہے جیسے ٹونے ٹوٹکے کے ذریعہ ہمالیہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کی امید قائم کرلی جائے۔ دوسرا طبقہ پرجوش تقریریں کرنے اور شاعرانہ الفاظ بولنے کو مسئلہ کا حل سمجھتا ہے۔ وہ بھول گیا ہے کہ خدا کی دنیا محکم قوانین کی دنیا ہے۔ یہاں لفظوں کا کمال دکھا کر کسی واقعہ کو ظہور میں نہیں لایا جا سکتا۔ ایک اور طبقہ اس انقلابی غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اپنے کسی بادشاہ کو تخت سے اتار کر یا اپنے کسی حکمراں کو پھانسی پر چڑھا کر وہ اسلام کی عظمت رفتہ کو واپس لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کو معلوم نہیں کہ یہ مسئلہ عالمی طاقتوں کو زیر کرنے کا مسئلہ ہے نہ کہ قوم کے کچھ افراد کو اسلام دشمنی کی "علامت" ٹھہرا کر ان کو کسی نہ کسی تدبیر سے ہلاک کر دینے کا۔

تبدیلی اقتدار کا قانون

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکومت کا مالک اللہ ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے (آل عمران ۲۶) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں کسی گروہ کا غلبہ و اقتدار حاصل کرنا کوئی سادہ واقعہ نہیں ہے۔ یہ براہ راست خدا کے فیصلہ کے تحت ہوتا ہے۔ ایک گروہ کا غلبہ ہمیشہ دوسرے گروہ کی مغلوبیت کی قیمت پر ہوتا ہے۔ ایسے ایک واقعہ کے ظہور کے لئے خارجی دنیا میں ایسی وسیع تر تبدیلیوں کا پیش آنا ضروری ہے جو ایک گروہ کے حق میں حالات کو موافق کر دیں اور دوسرے گروہ کے حق میں اس کو مخالف بنا دیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کا غیر معمولی تغیر ہمیشہ مافوق اسباب کے تحت ہوتا ہے۔ انقلاب خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، ہمیشہ ان اسباب کے زیر اثر آتا ہے جو کبھی کسی شخص یا جماعت کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے۔ روس کا اشتراکی انقلاب (۱۹۱۷) پہلی جنگ عظیم کے پیدا کردہ ہنگامی حالات کے بطن سے نکلا۔ موجودہ صدی کے وسط میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی مغربی استعمار سے آزادی دوسری جنگ

عظیم کے پیدا کئے ہوئے ہنگامی حالات کے اندر سے برآمد ہوئی۔ جب کہ اس قسم کی عالمی جنگ کو برپا کرنا نہ اشتراکی تحریک کے اختیار میں تھا اور نہ وطنی آزادی کی تحریک کے اختیار میں۔ اسی طرح دور اول میں مسلمانوں کی تیز فتوحات کا خاص سبب یہ تھا کہ ایران و روم کی سلطنتیں عین اسی زمانہ میں لمبی لڑائیاں لڑکر بالکل کمزور ہو چکی تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ وقت کی دو سب سے بڑی طاقتوں کے درمیان اس قسم کی تباہ کن جنگ چھیڑنا صرف خدا کے اختیار میں تھا نہ کہ کسی انسان کے اختیار میں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ عام قوموں کے درمیان سیاسی تبدیلیاں خدا کے قانون دفع (البقرہ ۲۵۱) کے تحت ظہور میں آتی ہیں۔ یعنی ایک ظالم اور مفسد کی سیاسی اجارہ داری کو ختم کرنے کے لئے اس کی جگہ کسی دوسرے کو لے آنا، ایک گروہ کے ذریعہ کسی دوسرے گروہ کو ہٹا دینا۔ بالفاظ دیگر، عام سیاسی تبدیلیاں زیادہ تر سلبی مقصد کے تحت ہوتی ہیں۔ مگر جہاں تک اسلامی انقلاب کا تعلق ہے وہ ایجابی مقصد کے تحت وقوع میں آتا ہے۔ اسلامی انقلاب اس لئے برپا کیا جاتا ہے کہ اللہ اپنے ان خاص بندوں پر احسان کرے جنھوں نے خدا کے مطلوبہ معیار کے مطابق اپنے شعور اور اپنے کردار میں صالحیت کا ثبوت دے دیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (النور ۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ ان لوگوں کو حکومت دی جو ان سے پہلے گزرے۔ اور ان کے دین کو جمادے گا جس کو ان کے لئے پسند کیا ہے اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا مسئلہ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہے کہ وہ عام طرز کی سیاسی یا غیر سیاسی تدبیروں سے وقوع میں آجائے۔ یہ کفر و شرک کی عالمی بالادستی کو ختم کرنے کا مسئلہ ہے۔ یہ غالب تہذیب کو مغلوب کرنے اور مغلوب تہذیب کو دوبارہ غلبہ کا مقام دینے کا مسئلہ ہے۔ یہ ایک تاریخی دور کو ختم کرکے دوسرا تاریخی دور واپس لانے کا مسئلہ ہے۔ مختصر الفاظ میں، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے حل کے لئے خدائی طاقتوں کی کارفرمائی درکار ہے۔

اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک طوفان نوح برپا ہو جس میں شیطان کی تمام نسل غرق ہوکر رہ جائے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ معجزۂ موسوی ظاہر ہو جو فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر کی موجوں کے حوالے کردے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ خدا کے فرشتے آسمان سے اتریں اور "بدر" کے میدان میں وقت کے تمام بڑوں کو جمع کرکے انھیں مسلمانوں کے قبضہ میں دے دیں۔ یہ واقعہ خدائی مدد سے ظہور میں آنے والا واقعہ ہے۔

مسلمان صرف اپنی محدود کوششوں سے اس کو برروئے کار نہیں لا سکتے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا قافلہ اپنے ہی قدموں پر چل کر آگے بڑھے گا مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس کے لئے زینہ خدا کی طرف سے فراہم ہوگا جس سے چھلانگ لگا کر وہ اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ حالات میں اس قسم کی غیر معمولی تبدیلی کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اس کا اہتمام ہمیشہ کائنات کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔

آج مسلمان جس مغلوبیت کی حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی سبیل محض معمول کی تحریکی کوششوں میں نہیں ہے بلکہ غیر معمولی حالات کے ظہور میں ہے۔ ہمارے حوصلوں کی کامیابی کا امکان صرف اس وقت ہوسکتا ہے جب کہ خدائی مداخلت ہماری جد وجہد کو ہمارے لئے سازگار بنا دے۔ جب زمین وآسمان کا مالک اپنی مافوق قوتوں سے سیاسی اور تمدنی چٹانوں میں ایسے درے پیدا کردے جن سے نفوذ کرکے ہم آگے جا سکتے ہوں۔ وہ ایسی موافق آندھیاں چلائے جس سے ایک طرف مخالف کیمپ کی طنابیں اکھڑیں اور دوسری طرف ملت اسلامیہ کی راہ ہموار ہوتی ہو۔ وہ ایسی بارش برسائے جو ایک کے لئے کیچڑ اور دلدل بنے اور دوسرے کے لئے سیرابی اور تازگی کا سامان پیدا کرے۔ وہ ایسا زلزلہ برپا کرے جس سے بلندیاں پست ہوجائیں اور پستیاں ابھر کر اوپر آجائیں۔ وہ مقابلہ کے وقت ایک فریق کے اوپر رعب اور دوسرے فریق کے اوپر اَمَنَۃ نازل کرے۔ جب تک اس قسم کی غیر معمولی آسمانی مدد ہمارا ساتھ نہ دے، محض سیاسی کارروائیاں یا جلسہ جلوس ہم کو کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے۔ دور اول کا اسلامی قافلہ بھی اسی قسم کی خداوندی نصرت سے کامیاب ہوا تھا اور آج بھی وہ کامیاب ہوگا تو اسی قسم کی نصرتوں سے کامیاب ہوگا

غلبہ کا ذریعہ دعوت الی اللہ

خدا کی اس برتر نصرت کا مستحق بننے کے لئے کسی مومن گروہ کو جس اہلیت کا ثبوت دینا ہے وہ ذاتی اصلاح کے بعد دعوت ہے۔ مومنین کے گروہ کے لئے خدا نے جس اجتماعی نصرت کا وعدہ کیا ہے وہ تمام تر اس پر موقوف ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں صاحب ایمان ہو، اور پھر داعی الی اللہ ہونے کا ثبوت دے۔ موجودہ دنیا میں اہل ایمان کی اصل ذمہ داری شہادت علی الناس (حج) ہے۔ اہل ایمان دنیا کی قوموں کے اوپر خدا کی طرف سے حق کے گواہ ہیں (انتم شھداء اللہ فی الارض، حدیث) اس لئے بالکل فطری ہے کہ اسی اصل حیثیت کے تحقق پر ان کو خدا کا وہ عظیم انعام ملے جس کو غلبہ وسرفرازی کہا جاتا ہے۔

مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کو لوٹتا ہے، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر غالب آنے کے لئے سرگرمیاں دکھاتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کے لئے دوسری

قوموں کی طرف سے بار بار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ وہ بار بار دوسرے گروہ کی زد میں آجاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر دوسری قوموں کے خلاف جذبات ابھرتے ہیں۔ وہ دوسری قوموں کی طرف سے اپنے کو خطرہ میں پاکر ان کے خلاف "جہاد" کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اس مسئلہ کو قرآن کی روشنی میں دیکھئے تو اس کا جواب اس سے بالکل مختلف ملے گا جو ایک عام قومی لیڈر ایسے حالات میں سوچتا ہے۔ قرآنی جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ مسئلہ خواہ جان و مال کے نقصان کی سطح پر پیدا ہو مگر اس کا حل تمھارے لئے ابدی طور پر دعوتی عمل میں رکھ دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جدوجہد کا مقام دعوت الی اللہ ہے نہ کہ وہ دنیوی محاذ جہاں بظاہر ان کا حریف انھیں خطرہ بنا ہوا نظر آتا ہے۔ قرآن کی اس آیت میں پیغمبر کے واسطہ سے امت کو یہی سبق دیا گیا ہے:

یا ایھا الرسول بَلِّغ ما اُنزِلَ الیکَ مِن ربِّک	اے رسول جو کچھ تم پر تمھارے رب کی طرف سے اترا ہے
فَاِن لم تفعَل فَما بَلَّغتَ رِسالَتَہ واللہ یَعصِمُک	اسے پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کا پیغام نہ پہنچایا
مِنَ النّاس (مائدہ ۶۷)	اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ عصمت من الناس کا راز دعوت الی اللہ میں چھپا ہوا ہے۔ جب بھی اہل ایمان کے لئے دوسروں کی طرف سے عدم تحفظ کا خطرہ ہو یا مغلوبیت کا سوال پیدا ہو تو ان کو دعوت الی اللہ کے کام کی طرف دوڑنا چاہئے۔ اسی کام میں لگنے سے خدا کا قانون ان کے حق میں متحرک ہوگا اور وہ غیر معمولی اسباب پیدا ہوں گے جو بالآخر ان کے لئے نجات اور کامیابی کا زینہ بن جائیں۔

دعوت دین کے کام کی ایک خاص فوقیت (Advantage) یہ ہے کہ فطرت کو ابدی طور پر اس کا ہم نوا بنا دیا گیا ہے۔ تعصب کی سطح پر کوئی آدمی خواہ کتنا ہی مخالف ہو مگر فطرت کی سطح پر حق کی آواز تمام انسانوں کے لئے اپنے دل کی آواز ہے۔ حق کی پکار ایک ایسی پکار ہے جس کا ایک مثنیٰ ہر آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ خدا کا دین اور انسان کی فطرت دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر اپنے خالق کا تصور لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی کا باطن اس کی اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ہر لمحہ زور کر رہا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ گویا دین حق ایک ایسا سودا ہے جس کا ہر آدمی پہلے سے خریدار بنا ہوا ہے۔

اس فطری مساعدت کے ساتھ اسلام کو ایک تاریخی مساعدت بھی حاصل ہے۔ وہ یہ کہ دوسرے تمام مذاہب اپنے ماننے والوں کی تحریفات کے نتیجہ میں اپنا اصلی حسن کھو چکے ہیں۔ وہ اتنا بدل چکے ہیں کہ ان میں اور فطرت انسانی میں وہ مطابقت باقی نہیں رہی جو فی الواقع دونوں کے خالق نے دونوں کے درمیان رکھی تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں جتنے لوگ کسی دوسرے مذہب کو مانتے ہیں وہ صرف روایت پرستی کی بنا پر اس کو مانتے

ہیں۔ وہ تعصب کی زمین پر کھڑے ہوئے ہیں نہ کہ فی الواقع فطری تصدیق کی زمین پر۔ کیونکہ فطری تصدیق وہاں سرے سے موجود ہی نہیں۔ اگر ہم کسی طرح تعصب کا پردہ ہٹا دیں تو تمام دوسرے مذاہب بے زمین ہو جائیں گے اور لوگوں کو اس کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہ دے گا کہ وہ اسلام کے سایہ میں پناہ لیں۔

دعوتی تسخیر کی مثالیں

دعوت میں ہمارے لئے زندگی کا راز چھپا ہوا ہے، یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ اس نظریہ کے حق میں واضح تائید پیش کرتی ہے۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اپنے پیغمبرانہ کام کا آغاز فرمایا۔ مگر مکہ کی زمین آپ کے لئے انتہائی سخت ثابت ہوئی۔ نبوت کے بارھویں سال بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی تاریخ مکہ سے شروع ہو کر مکہ ہی میں ختم ہو جائے گی۔ مگر اس کے بعد حیرت انگیز طور پر یثرب (مدینہ) میں یہ مواقع پیدا ہو گئے کہ آپ ہجرت کر کے وہاں جائیں اور وہاں اسلام کا مرکز قائم کریں۔ مدینہ میں یہ نیا امکان کیونکر پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہی جواب ہے، اور وہ یہ کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ۔ مدینہ میں چند لوگوں کی دعوتی جدوجہد کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہاں گھر گھر اسلام پھیل گیا (حتیٰ لم تبق دارٌ من دُور الانصار الا وفیھا رجال ونساء مسلمون، سیرۃ ابن ہشام جلد اول) اس طرح انتہائی مشکل اور مایوس کن حالات میں اسلام کی اشاعت کے ذریعہ مدینہ میں مسلمانوں کے لئے زندگی کے مواقع کھلے۔

۲۔ ہجرت نے اگرچہ مسلمانوں کے لئے اپنا ایک علاقہ مہیا کر دیا تھا۔ مگر مخالفین اسلام نے باقاعدہ جنگ چھیڑ کر دوبارہ اسلام کے لئے شدید حالات پیدا کر دئے۔ اسلام ایسی مشکلات میں گھر گیا کہ ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ اسلام کے دشمن شاید اسلام کا وجود مٹا دیں گے۔ اس وقت پھر دعوت ہی تھی جس نے دوبارہ اسلام کے لئے نئے حالات کا دروازہ کھولا۔ حدیبیہ کی صلح کی صورت میں ہر ممکن قیمت دے کر جنگ وجدال کا ماحول ختم کر دیا گیا اور پُرامن حالات میں از سر نو دعوتی عمل جاری کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو سال میں مسلمانوں کی تعداد چوگنے سے بھی زیادہ ہو گئی۔ بالآخر قریش کے سردار اتنا مرعوب ہوئے کہ لڑے بھڑے بغیر ہتھیار ڈال دئے۔

۳۔ فتح مکہ کے بعد پھر ایک بہت بڑا مسئلہ قبیلہ ثقیف کی صورت میں پیدا ہوا۔ وہ بے حد سرکش تھے اور دیواری شہر کے مالک ہونے کی وجہ سے ان پر فوجی کارروائی کرنا مسلمانوں کے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے بظاہر ناممکن تھا۔ اس وقت قبیلہ ثقیف کو جس چیز نے زیر کیا وہ دعوت ہی تھی۔ قبیلہ ہوازن (۶ ہزار) کے ساتھ تالیف قلب کا طریقہ اختیار کر کے انھیں اسلام میں داخل کر لیا گیا۔ قبیلہ ہوازن طائف کے قبیلہ ثقیف کا

حلیف تھا۔ چنانچہ ان کے عمومی طور پر اسلام قبول کرتے ہی قبیلہ ثقیف کو محسوس ہوا کہ ان کا بازو ٹوٹ چکا ہے اور اب ان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ مدینہ جاکر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہوجائیں ——— طائف کا دروازہ فوجی مہم کے لئے بند تھا، مگر دعوتی مہم کے لئے وہ کھلا ہوا نظر آیا۔

۴۔ اس کے بعد اسلامی تاریخ مختلف مراحل طے کرتی ہوئی آٹھویں صدی ہجری میں پہنچتی ہے۔ تاتاری قبائل ملکوں اور شہروں کو زیر و زبر کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں اور بغداد کی عظیم مسلم سلطنت کو تاراج کرکے رکھ دیتے ہیں۔ چنگیز خاں وسط ایشیا سے ۱۲۱۶ء میں ساٹھ ہزار وحشی انسانوں کو لے کر نکلا۔ یہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہوکر اور تیر اور تلوار لئے ہوئے آبادیوں پر ٹوٹ پڑے اور تمام تمدنی نشانات کو برباد کر ڈالا۔ عراق، ایران، ترکستان ان کے قدموں کے نیچے زیر و زبر ہو گئے جہاں اس وقت کی طاقت ور ترین سلطنت قائم تھی۔ سارے عالم اسلام پر دہشت کا سناٹا چھاگیا۔ ۱۲۵۳ء میں چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو کی سرکردگی میں یہ طوفان دوبارہ اٹھا اور ان چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو بھی تہس نہس کر ڈالا جو عظیم مسلم خلافت کی بربادی کے بعد ابھرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم عصر مورخ ابن اثیر (م ۶۳۸ھ) کے الفاظ میں "اگر کوئی شخص کہے کہ آدم سے لے کر اب تک ایسا کوئی حادثہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو اس کا کہنا غلط نہ ہوگا" ایک مغربی مورخ کے نزدیک یہ واقعہ اتنا ہولناک تھا کہ اس کے قلم سے یہ الفاظ نکلے:
"آسمان نے زمین پر گر کر تمام چیزوں کو مٹا دیا"

Jenghiz Khan, by Harold Lamb, P. 266

اس نازک وقت میں اسلام کی دعوتی طاقت ہی تھی جس نے تاتاریوں کے نہ رکنے والے سیلاب سے اسلام کو بچایا۔ تاتاری اپنی مفتوح رعایا کے ذریعہ اسلام سے متعارف ہونا شروع ہوئے۔ یہاں تک کہ اسلام نے انھیں جیت لیا اور ان کی اکثریت نے اسلام قبول کرلیا۔ اسلام کے دشمن اسلام کے پاسبان بن گئے۔ یہ کام کن مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ اس سلسلہ میں وقت کی قابل ذکر شخصیتوں کا نام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتا۔ غالباً یہ واقعہ بھی اسی طرح ظہور میں آیا جس طرح موجودہ زمانہ میں قبول اسلام کے واقعات ظہور میں آرہے ہیں۔ آج مختلف ملکوں میں لوگ کثرت سے اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مگر ان نومسلموں تک اسلام کو پہنچانے کا کام اکابر کے ذریعہ نہیں ہو رہا ہے۔ یہ دراصل کچھ غیر معروف اصاغر ہیں جو خاموشی کے ساتھ دعوت دین کا کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح آٹھویں صدی ہجری میں تاتاریوں میں تبلیغ اسلام کا کام بھی غالباً کچھ غیر مشہور مسلمانوں کے ذریعہ انجام پایا۔ تاتاریوں کے سلسلے میں اسلام کی دعوتی قوت کا اعتراف عام طور پر مورخین نے کیا ہے۔ یہاں ہم دو غیر مسلم محققین کے اقتباسات نقل کرتے ہیں:

Although in after years this great empire was split up and the political power of Islam diminished, still its spiritual conquests went on uninterruptedly. When the Mongols hordes sacked Baghdad (AD 1258) and drowned in blood the faded glory of the Abbasid dynasty, Islam had just gained a footing in the island of Sumatra and was just about to commence its triumphant progress through the island of the Malay Archipelago. In the hours of its political degradation, Islam has achieved some of its most brilliant spiritual conquests: on two great historical occasions, infidel barbarians have set their feet on the necks of the followers of the Prophet the Saljuq Turks in the eleventh and the Mongols in the thirteenth century and in each case the conquerers have accepted the religion of the conquered.

T.W. Arnold, The Preaching of Islam (1896) P. 2

بعد کے سالوں میں اگرچہ یہ عظیم سلطنت ٹوٹ گئی اور اسلام کی سیاسی قوت کم ہوگئی۔ مگر اس کی روحانی فتوحات بغیر وقفہ کے برابر جاری رہیں۔ مغل قبائل نے جب ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کی شان وشوکت کو خون میں غرق کر دیا، اس وقت اسلام جزیرہ سماترا میں اپنی جگہ بنا چکا تھا اور جزائر ملایا میں اپنا فاتحانہ سفر شروع کر رہا تھا۔ اپنے سیاسی زوال کے زمانہ میں اسلام نے اپنی بعض انتہائی نمایاں روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ دو بڑے مواقع پر کافر قبائل نے اپنے پاؤں محمد کے پیروؤں کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں سلجوق ترکوں نے اور تیرھویں صدی عیسوی میں مغلوں نے، مگر ہر بار فاتح نے اپنے مفتوح کے مذہب کو قبول کر لیا۔

Hard pressed between the mounted archers of the wild Mongols in the Fast and the mailed knights of the Crusaders on the West, Islam in the early part of the 13th century seemed for ever lost. How different was the situation in the last part of the same century, The last crusader had by that time been driven into the sea. The seventh of the Īl-Khans, many of whom had been flirting with Christianity, had finally recognised Islam as the state religion - A Dazzling victory for the faith of Mohammad. Just as in the case of the Seljuqs, the religion of the Muslims had conquered where their arms had failed. Less than half a century after Hulagu's merciless attempt at the destruction of Islamic culture, his grcat-grandson Ghazan, as a devout Muslim, was consecrating much time and energy to the revivification of the same culture.

History of the Arabs, The Macmillan press Ltd., London, 1968, P.488

مشرق میں وحشی منگولوں کے تیر اندازوں کی یلغار اور مغرب میں زرہ پوش صلیبی سرداروں کے درمیان تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ مگر اسی صدی کے آخری حصہ میں صورت حال کتنی مختلف ہو چکی تھی۔ آخری صلیبی اس وقت سمندر میں دھکیلا جا چکا تھا۔ گیارہ تاتاری خانوں میں سے ساتویں خان نے، جن میں سے اکثر (کے یہاں عیسائی بیویاں تھیں اور) وہ عیسائیت کی طرف مائل تھے، بالآخر اسلام کو سرکاری مذہب کے طور پر تسلیم کر لیا۔ محمد کے مذہب کی یہ کیسی شاندار فتح تھی۔ بالکل سلجوقوں کے معاملہ کی طرح، مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے۔ ہلاکو کے ہاتھوں اسلامی تہذیب کی بے رحمانہ تباہی کے بعد نصف صدی سے بھی کم مدت میں اس کا پوتا غازان مسلمان ہو کر اسی تہذیب کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت اور قوت خرچ کر رہا تھا۔ (فلپ کے ہٹی)

ایک تاریخی سبق

تاتاریوں کا یہ قیامت خیز واقعہ امام تقی الدین ابن تیمیہ (۶۶۱ - ۷۲۸ھ) کے زمانہ میں ہوا۔ اسلام کی عظمت کو مٹتا ہوا دیکھ کر انھیں جوش آیا۔ امام ابن تیمیہ مجاہدانہ جذبہ کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے شام و مصر کے مسلمانوں کو یہ نعرہ دیا کہ جنگ کا علاج جنگ ہے (الحروب انفی للحروب[5]) وہ ۷۰۲ھ میں مصر کے سلطان الناصر کے ساتھ تاتاریوں سے جنگ کے لئے نکلے۔ ابتدائی طور پر انھیں تاتاریوں کے ایک دستہ کے مقابلہ میں کچھ فوجی کامیابی حاصل ہوئی۔ مگر بالآخر تاتاری غالب رہے اور امام ابن تیمیہ کچھ دن دمشق کے قلعہ میں اور کچھ دن تدریس و تصنیف میں زندگی گزار کر اس دنیا سے چلے گئے۔

امام ابن تیمیہ تاتاریوں کے مسئلہ کو فوجی قوت سے ختم کرنا چاہتے تھے مگر وہ اس کو ختم نہ کر سکے۔ عین اس وقت اسلام کی دعوتی قوت ظاہر ہوئی اور اس نے تاتاریوں کے مسئلہ کو نہ صرف ختم کیا بلکہ ان کو اسی اسلام کا خادم بنا دیا جس کی جڑوں کو اکھاڑنے کے لئے وہ قسمیں کھا چکے تھے ——— آٹھویں صدی ہجری کا یہ تجربہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے سبق دے رہا تھا کہ اسلام کی حفاظت اور اس کی سربلندی کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔ مگر عجیب بات ہے کہ مسلمانوں نے اس عظیم تاریخی واقعہ سے کوئی سبق نہیں لیا۔ موجودہ زمانہ میں دورِ جدید کے "تاتاریوں" کی طرف سے اسلام کے لئے مسائل پیدا ہوئے تو دوبارہ مسلمانوں کی پوری قیادت حملہ آوروں کے خلاف سیاسی جہاد میں مصروف ہو گئی۔ اس پوری مدت میں کوئی قابلِ ذکر شخص نظر نہیں آتا جو دعوتی جہاد کو جہاد سمجھے اور اس کے لئے سرگرم ہو۔

اسلام جدید دور میں

نپولین نے ۱۷۹۸ء میں مصر و شام پر حملہ کیا۔ اس سے دو سو سال پہلے سولھویں صدی عیسوی میں پرتگالی تاجر ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے بعد دوسری مغربی قومیں آئیں۔ اس طرح پچھلی چند صدیوں میں پرتگال، ہالینڈ، فرانس اور برطانیہ نے پوری مسلم دنیا پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اولاً برصغیر ہند کی مغل سلطنت اور اس کے بعد ترکی کی عظیم عثمانی خلافت ختم ہو گئی۔ موجودہ صدی میں اگرچہ سیاسی استعمار ختم ہو چکا ہے مگر تکنکی استعمار کی صورت میں مغرب اب بھی پوری طرح مسلم دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ دفاعی ہتھیاروں کی خریداری سے لے کر قرآن مقدس کی طباعت و اشاعت تک تمام کاموں کے لئے مسلمان انھیں مغربی قوموں کے دست نگر ہیں۔

---

[5] محمود مہدی الاستانبولی، ابن تیمیہ بطل الاصلاح الدینی، مکتبہ دار المعرفۃ، دمشق، ۱۳۹۷ھ، صفحہ ۳۶

مغربی تسلط کا مسئلہ پیدا ہوتے ہی پوری مسلم دنیا میں اس کے خلاف تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور اب بھی بدستور جاری ہیں۔ پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کے درمیان جتنی بھی تحریکیں اٹھی ہیں سب کے پیچھے اصل قوت محرکہ یہی اجنبی تسلط کا مسئلہ نظر آتا ہے۔ یہ تحریکیں بظاہر ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے۔ سب کا طرز فکر بنیادی طور پر سیاسی ہے۔ ان سب کو ایک عنوان کے تحت جمع کرنا ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ ان کا مقصد اجنبی اقوام کے پیدا کردہ مسائل کا سیاسی حل تلاش کرنا تھا۔

یہ تحریکیں تقریباً بلا استثنا صد فی صد ناکام رہیں۔ جان و مال کی بے پناہ قربانیوں کے باوجود ان کا کوئی حقیقی حاصل مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آیا —— مسلمانوں کے عالمی سیاسی اتحاد کے لئے اتحاد اسلامی (پان اسلام ازم) کی تحریک چلائی گئی۔ مگر اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ عثمانی خلافت اور مغل سلطنت دونوں ٹوٹ گئیں اور ان کے زیر حکومت علاقے درجنوں الگ الگ مسلم خطے میں بٹ گئے۔ مسلمانوں نے مغرب کے سیاسی استعمار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بے شمار جانیں قربان کیں اور بے حساب مال لٹا دیا مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ سیاسی استعمار ختم ہو کر سائنسی اور تکنکی استعمار ان کے اوپر مسلط ہو گیا۔ مسلمانوں نے اجنبی محکومی سے نجات پانے کے لئے اپنی ساری طاقت لگا دی مگر جب اجنبی محکومی ختم ہوئی تو خود اپنے ملک کے ملحدوں اور باغیوں کی محکومی ان کے اوپر قائم ہو چکی تھی۔ مسلمانوں نے ایک اسلامستان بنانے کے لئے تاریخ کی سب سے بڑی قربانی دی۔ مگر جب وہ بنا تو صرف یہ ہوا کہ ایک واحد ملک کے مسلمان کئی چھوٹے چھوٹے ملکوں میں تقسیم ہو گئے —— فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کے سوال پر ساری مسلم دنیا ایک ہو گئی اور اس کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا۔ مگر اسرائیل کا حال یہ ہے کہ اس کی طاقت اور رقبہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے جس جس میدان میں بھی کوشش کی ہے ہر میدان میں انھوں نے صرف کھویا ہے، انھوں نے کچھ بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ بائبل کے نبی حجی کے الفاظ میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کر رہا ہے"، مگر اس عمومی محرومی کی فضا میں حیرت انگیز طور پر ایک ایسا میدان موجود ہے جہاں اسلام اپنے آپ پیش قدمی کر رہا ہے۔ جب کہ بقیہ میدانوں میں بے شمار کوششیں اور قربانیاں بھی کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام ہیں، یہاں کسی قابل ذکر کوشش کے بغیر اپنے آپ مفید نتیجہ ظاہر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہ میدان اسلام کی اشاعت کا میدان ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو غیر مسلموں تک پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ تقریباً ساری دنیا میں اسلام اپنے آپ غیر مسلم

قوموں میں پھیلتا جارہا ہے ۔ ہندستان میں ہریجن عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کررہے ہیں ۔ جاپان میں سنجیدہ طبقہ بہت تیزی سے اسلام کی طرف مائل ہو رہا ہے ۔ امریکہ میں کالی نسل کے لوگ کثرت سے اسلام قبول کررہے ہیں ۔ افریقہ کے پس ماندہ قبائل ہر دن ہزاروں کی تعداد میں اسلام کے دائرہ میں داخل ہو رہے ہیں، وغیرہ۔ اسلام کی یہ لہر صرف نچلے طبقات تک محدود نہیں ہے ۔ موجودہ زمانہ میں تقریباً ہر ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اونچی حیثیت کے لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے ، اور یہ سب کچھ مسلمانوں کی کسی کوشش کے بغیر اپنے آپ ہو رہا ہے ۔

مواقع انتظار کرتے رہے

۱۹ ویں صدی کے نصف ثانی اور ۲۰ ویں صدی کے نصف اول میں جب کہ مسلم قائدین انتہائی بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان سے اپنا سر ٹکرا رہے تھے، متعدد ایسے نمایاں واقعات ظہور میں آئے جو کھلا ہوا اشارہ دے رہے تھے کہ کرنے کا کام دعوت و تبلیغ ہے نہ کہ حکمرانوں سے سیاسی تصادم ۔ نمونہ کے طور پر ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

کان میکادو الیابان قد ارسل فی زمن وجود السید بالاستانہ (۱۸۹۱) کتابا الی السلطان عبد الحمید یخطب فیہ مودتہ ویقول : ان کلا منا ملک شرقی ، ومن مصلحتنا ومصلحۃ شعوبنا ان نتعارف ونتزاور وتکون الصلات بیننا قویۃ تجاہ الدول والشعوب الغربیۃ التی تنظر الینا بعین واحدۃ۔ اننی اری شعوب الافرنج یرسلون الی بلادنا دعاۃ الی دینہم لحریۃ الدین عندنا ولا اراکم تفعلون ذلک ، فانا احب ان ترسلوا الینا دعاۃ یدعون الی دینکم (الاسلام) ویمکن ان یکون ہولاء صلۃ معنویۃ بیننا وبینکم (صفحہ ۳۲)

محمود ابوریہ ، جمال الدین افغانی ، لجنۃ التعریف بالاسلام ، القاہرہ ، ۱۳۸۶ ھ

۱۸۹۱ میں جب کہ سید جمال الدین افغانی آستانہ (ترکی) میں تھے ، جاپان کے شہنشاہ میجی (۱۹۱۲ - ۱۸۶۸) نے سلطان عبد الحمید ثانی کے پاس ایک خط بھیجا ۔ اس خط میں اس نے دوستی کا اظہار کرتے ہوئے لکھا: ہم دونوں مشرقی بادشاہ ہیں ۔ ہماری مصلحت اور ہماری قوم کی مصلحت یہ ہے کہ ہم باہم متعارف ہوں اور ملیں جلیں ۔ اور ہمارے درمیان مضبوط رشتہ ہو تاکہ ہم مغربی قوموں اور سلطنتوں کا مقابلہ کرسکیں جو ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہیں ۔ میں دیکھتا ہوں کہ مغربی قومیں ہمارے ملک میں اپنے دینی مبلغ بھیج رہی ہیں کیونکہ ہمارے ملک میں مذہبی آزادی ہے ۔ مگر میں نہیں دیکھتا کہ آپ بھی ایسا کرتے ہوں ۔ میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ آپ بھی جاپان میں ایسے لوگ بھیجیں جو یہاں آپ کے دین اسلام کی تبلیغ کریں ۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہمارے اور آپ کے درمیان مضبوط معنوی رشتہ قائم ہو جائے ۔

شہنشاہ جاپان کا یہ خط جب ترکی کے دار السلطنت پہنچا ، اس وقت سید جمال الدین افغانی اور دوسرے بڑے بڑے علماء اور اکابر وہاں موجود تھے ۔ سلطان عبد الحمید ثانی نے ان لوگوں کو جمع کرکے شہنشاہ جاپان کا

خط دکھایا مگر کسی نے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہ لی۔ جاپان کا سرکاری قاصد رسمی شکریہ کا جواب لے کر واپس چلا گیا۔

قریبی ماضی میں اس طرح کے عظیم مواقع کو استعمال نہ کرنے کی وجہ صرف ایک تھی، دعوتی کام کی اہمیت سے مسلمانوں کا غافل ہونا۔ لوگ بطور خود جن سیاسی یا غیر سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے بس اسی کو دہ کام سمجھتے رہے۔ اور غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے کام کو غیر اہم سمجھ کر نظرانداز کر دیا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ غیر مسلموں کا قافلہ خود ان کے یہاں آکر ان کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔

خدائی فیصلہ

انیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں برطانیہ کے شاہی خاندان کے ایک فرد لارڈ ہیڈلے فاروق نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ بیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں گابون (افریقہ) کے صدر مملکت محمد عمر بانگو نے اسلام کو اپنا دین بنانے کا اعلان کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسی طرح غیر مسلم اقوام کے لاکھوں لوگ اپنے آبائی دین کو چھوڑ کر اسلام کے دائرہ میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ ان میں نہ صرف عوام ہیں بلکہ تاجر، ڈاکٹر، انجینئر، اہل علم اور سرکاری عہدہ دار جیسے لوگ بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی انتہائی نادان سیاست کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمان سخت مغلوبیت کی حالت میں پہنچ گئے تھے، اچانک اسلام کی دعوتی قوت نے اپنا کرشمہ دکھایا اور یہاں کے پس ماندہ طبقات نے عمومی پیمانہ پر اسلام قبول کرنا شروع کر دیا۔ یہ واقعہ کتنا عظیم ہے۔ اس کا اندازہ ایک اقتباس سے ہوگا۔ مسٹر کرشنا دھن سردار (رامیشور پور، مغربی بنگال) اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ ہندو دوسرے جنم میں عقیدہ رکھتے ہیں۔ اور ہندوازم کا نیا جنم عمومی طور پر اسلام قبول کرنے کی صورت میں فروری کے وسط میں تامل ناڈو میں شروع ہوگیا ہے:

> Hindus believe in re-birth and the re-birth of Hinduism has taken place in Meenakshipuram (Tamil Nadu) in the middle of February (1981) in the form of mass conversion to Islam.
>
> Radiance Weekly, August 9, 1981

اس قسم کے واقعات جو دنیا بھر میں ہو رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام موجودہ تحریکوں کو خدا کی نظر میں بے اعتبار (Discredit) ٹھہرانے کے ہم معنی ہیں۔ مسلمان جن میدانوں میں جان و مال کی قربانی دے کر اپنا مستقبل تلاش کرتے رہے وہاں سے کسی بھی درجہ میں مطلوبہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ان میدانوں میں ان کی کوششیں حبطِ اعمال کا مصداق بنتی رہیں۔ دوسری طرف وہ میدان جہاں جدید مسلم قیادت نے دنیا بھر میں کہیں سرے سے کوئی کوشش ہی نہ کی تھی وہاں اپنے آپ لہلہاتی ہوئی فصل نکلی چلی آرہی ہے۔ اس طرح خدا بتا رہا ہے کہ تم جن مقامات پر میری مدد تلاش کر رہے ہو وہاں مجھے مدد دینا مطلوب ہی نہیں ہے۔ یہ زمین

وہ زمین ہی نہیں جہاں میرے انعامات کی فصل اگتی ہو۔ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میری وہ مدد تمھیں حاصل ہو جس سے بند دروازے کھلتے ہیں اور چٹانیں اپنی جگہ سے کھسکنے لگتی ہیں تو تم دعوت کی زمین میں اپنی کوششیں صرف کرو جس کو میں نے اتنا زرخیز بنایا ہے کہ کسی عمل کے بغیر ہی اس کے اندر سے شان دار فصل نکلی چلی آرہی ہے۔

خدا ہم کو دعوت و تبلیغ کے میدان میں سرگرم ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اگر مسلمان قدرت کے اس اشارہ کو سمجھیں اور اپنی کوششوں کو غیر مسلموں کے درمیان دعوت الی اللہ کے کام میں لگا دیں تو موجودہ نتائج کی رفتار کئی گنا بڑھ جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ موجودہ نسل ہی میں غلبۂ اسلام کا وہ خواب پورا ہو جائے جس کی تعبیر ہم صدیوں سے دوسرے میدانوں میں تلاش کر رہے ہیں مگر وہ کسی طرح پورا نہیں ہوتا۔

عبرتناک منظر

مغرب کے مشہور مفکر جارج برنارڈ شا (۱۹۵۰ - ۱۸۵۶) نے کہا تھا کہ اگر کوئی مذہب ہے جو اگلے سو سال میں انگلستان پر حکومت کرے، نہیں بلکہ سارے یورپ پر حکومت کرے تو وہ صرف اسلام ہوگا۔ میں نے محمد کے مذہب کو ہمیشہ بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر حیرت انگیز طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ بدلتی ہوئی دنیا کو اپنے اندر جذب کر سکے، جس کے اندر ہر دور کے لئے اپیل ہے:

> If any religion has the chance of ruling over England, nay Europe, within the next hundred years, it can only be Islam. I have always held the religion of Muhammad in high estimation because of its wonderful vitality. It is the only religion which appears to me to possess the assimilating capability to the changing face of existance, which can make its apeal to every age.

ہندستان کے مشہور ہندو مفکر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲ - ۱۸۶۳) نے لکھا تھا کہ ادویتا واد مذہب اور فکر کی دنیا میں آخری لفظ ہے اور واحد پوزیشن ہے جہاں سے ایک شخص تمام مذاہب اور فرقوں کو محبت کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ تاہم عملی ادویتا واد جو تمام انسانیت کو خود اپنی طرح دیکھتی ہے اور اپنوں کا سا سلوک کرتی ہے، کبھی ہندوؤں میں پیدا نہ ہو سکی۔ دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب قابل لحاظ حد تک اس مساوات کو پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اسی لئے میں قطعی طور پر یہ خیال رکھتا ہوں کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر ویدانت کے نظریات بالکل ہی بے قیمت ہیں۔ ہمارے مادر وطن (ہندستان) کے لئے جو دو عظیم نظامات، ہندو ازم اور اسلام کا مقام اتحاد ہے، ویدانت کا دماغ اور اسلام کا جسم ہی واحد امید ہے۔ میں اپنے تصور کی نگاہ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا میعاری ہندستان موجودہ انتشار اور اختلاف سے نکل کر شان دار اور غیر مفتوح بن رہا ہے، اور یہ ویدانت کے دماغ اور

اسلام کے جسم کے ذریعہ ہورہا ہے :

I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strive, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.

Letters of Swami Vivikanand (1970) P.453

کیسی عجیب بات ہے۔ جدید انسان کو جہاں اپنی زندگی کی کہانی اسلام کے بغیر نا مکمل دکھائی دیتی ہے، وہاں ہمیں کرنے کا کوئی کام نظر نہیں آتا۔ اور جہاں جدید انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام کے بغیر اس کی کہانی آخری حد تک مکمل ہے، وہاں ہم اس کی پتھریلی دیوار سے اپنا سر ٹکرا رہے ہیں۔ اس سے زیادہ عبرتناک منظر شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی واحد امید ہے، دنیا کی بھی اور خود مسلمانوں کی بھی۔ دنیا، اپنی تمام ترقیوں کے باوجود، اس لئے بے چین ہے کہ اس کو مالک کائنات کی سچی رہنمائی حاصل نہیں۔ مسلمان اس لئے برباد ہیں کہ ان کے ذمہ خدا کی سچائی کو دوسروں تک پہنچانے کا کام سپرد کیا گیا تھا اور اس کو انھوں نے چھوڑ دیا۔ بقیہ دنیا حق سے محرومی کی سزا بھگت رہی ہے اور مسلمان حق سے غفلت کی۔ یہ صورت حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمان حق کے داعی بن کر کھڑے نہ ہوں۔ دوسرے کاموں میں مشغول ہونا یا دوسرے کاموں کو دعوت و تبلیغ کا نام دینا صرف ان کے جرم میں اضافہ کرتا ہے، نہ کہ وہ انھیں خدا کی رحمتوں کا مستحق بنائے ——— مسلمان اگر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو ان کے لئے اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ اور اگر وہ اس مطلوبہ کام کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کی اس دنیا میں ان کے لئے کچھ نہیں۔

آسٹریلیا کی ایک مسیحی خاتون نے اپنی کتاب میں اسلام کا تعارف کرتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے :

This is the passing glimpse of Islam. And it has much to offer to our restless world. But it seems to be an abandoned treasure, abandoned by those who bear its name. No wonder their lives are so different from the glory I described. And unless they return back to it again, they will remain in bewilderment in the re^r of humanity's procession. For it is remedy, light and guidance from God, for them and for the world. (P.44)

Dr Cheris Wady, The Muslim Mind, Macmillan Co. Ltd. Bombay

یہ اسلام کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ اور اس میں ہماری بے چین دنیا کے لئے بہت کچھ ہے۔ مگر یہ بظاہر ایک چھوڑا ہوا خزانہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کو ان لوگوں نے چھوڑ رکھا ہے جو اس کا نام لیتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ ان کی زندگیاں اس عظمت سے بہت مختلف ہیں جو میں نے بیان کیا۔ اور جب تک وہ دوبارہ اس اسلام کی طرف واپس نہ ہوں وہ حیران و پریشان انسانیت کے قافلہ سے بچھڑے ہی رہیں گے۔ کیونکہ خدا کی طرف سے یہی ایک علاج اور روشنی اور رہنمائی ہے ان کے لئے بھی اور ساری دنیا کے لئے بھی۔

اوپر ہم نے قرآن کے اس ارشاد کا تاریخی مطالعہ کیا ہے کہ عصمت من الناس کا راز تبلیغ ما انزل اللہ میں ہے (مائدہ ۶۷) یہ بات جب پہلی بار پیغمبر کی زبان پر جاری کی گئی تو وہ واقعات سامنے نہیں آئے تھے جن کا اوپر ذکر ہوا۔ یہ تاریخ ابھی مستقبل کے پردہ میں چھپی ہوئی تھی۔ ایسے وقت میں ان الفاظ پر یقین لانا اور اس کی راہ میں اپنے جان و مال کو وقف کرنا بلاشبہ مشکل ترین کام تھا۔ تاریخ کو اس کے اختتام پر دیکھنا جتنا آسان ہے، تاریخ کو اس کے آغاز پر دیکھنا اتنا ہی زیادہ مشکل ہے۔ دور اول کے مسلمانوں نے تاریخ کے مشکل ترین کام کو انجام دیا۔ انھوں نے واقعہ کے ظہور میں آنے سے پہلے واقعہ کو دیکھا اور اس کی خاطر مطلوبہ عمل کیا۔ اس کے مقابلہ میں ہمارے حصہ میں تاریخ کا آسان ترین کام آیا تھا۔ ایک اصول کے تاریخی واقعہ بن جانے کے بعد ہمیں اپنی زندگیوں میں اسے دہرانا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہمارے پیش رو تو مشکل ترین امتحان میں پورے اترے اور ہم آسان ترین امتحان میں بھی ناکام ہو گئے۔

بے شک اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا (مائدہ ۶۷) اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ مسلمان اگر خدا کے بتائے ہوئے اصول پر دعوت الی اللہ کا کام کریں تو خدا ان کے مخالفین کو ایسا اندھا کر دے گا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی مؤثر منصوبہ بندی نہ کر سکیں اور ان کو برباد کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں۔ تاہم دوسرے پہلو کے اعتبار سے اس کا تعلق خود داعی سے بھی ہے، اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مسئلہ کی وضاحت کے بعد اگر مسلمان اس کو نہ مانیں اور اس طریقہ کو چھوڑ کر وہ اپنے تحفظ اور احیار کے لئے دوسرے راستوں میں محنت کریں تو خدا ان کی محنتوں کو بارآور ہونے نہ دے گا۔ وہ ان کو کامیابی کے رخ پر نہیں چلائے گا۔ ان کی بڑی بڑی کوششیں بھی عملاً بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مسلمانوں کی کوششوں کے ساتھ یہی کچھ پیش آیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے اپنے احیار کے لئے جان و مال کی بے حساب قربانیاں دیں مگر ان کی تمام قربانیاں بالکل لاحاصل ہو کر رہ گئیں۔ حضرت مسیح سے پہلے نبی حجی نے جو کچھ یہود کے بارے میں کہا تھا وہ آج پوری طرح مسلمانوں کے اوپر چسپاں ہو رہا ہے —— تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ تم نے بہت کی امید رکھی اور تم کو تھوڑا ملا اور جب تم اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا۔

مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں بڑی بڑی تحریکیں اٹھائیں۔ مگر خدا نے ان کے "کھلیان" کو ہوا میں اڑا دیا۔ یہ خدائی تنبیہ اگر مسلمانوں کے لئے کافی نہیں تو اس کے بعد ان کی بیداری کے لئے صور اسرافیل کا انتظار کرنا چاہیے۔

ضابطۂ فطرت

خدا نے جتنی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی کارکردگی کا اس نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے۔ ہر چیز ٹھیک اسی پیمانہ کے مطابق اپنا عمل کرتی ہے (الفرقان ۲) سورج، چاند اور ستاروں کی گردش کے نہایت محکم ضابطے ہیں اور ایک لمحہ کے فرق کے بغیر وہ ٹھیک اسی کے مطابق اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں (یٰس ۳۹) ایک عورت کے پیٹ میں بچہ کی پرورش کا آغاز ہوتا ہے، وہ اس کے اندر دھیرے دھیرے بڑھتا ہے اور بالآخر ایک مکمل انسان کی صورت میں تیار ہو کر ایک متعین وقت پر باہر آجاتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے لئے خدا کے یہاں ایک مقدار مقرر ہے (کل شئ عندہ بمقدار، الرعد ۸) اسی ضابطہ بندی کی وجہ سے یہ ممکن ہوتا ہے کہ ہر چیز کا سفر اس طرح جاری رہے کہ دوسرے سے ٹکرائے بغیر وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے (لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا اللیل سابق النھار کل فی فلک یسبحون، یٰس ۴۰)

یہ اصول صرف ان چیزوں کے متعلق نہیں ہے جہاں خدا کے براہ راست حکم کے تحت کوئی نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ ٹھیک یہی اصول ان انسانی معاملات میں بھی ہے جہاں انسان کی اپنی کوششوں سے واقعات ظہور میں آتے ہیں۔

انسانی واقعات کے لئے مقرر ضابطہ

قدیم عربوں میں یہ رواج تھا کہ جب بھی کسی کو اپنی بیوی پر غصہ آیا، فوراً اس نے تین طلاق بلکہ سو طلاق دے دی اور اس کے بعد ہی عورت کو گھر سے نکال دیا۔ اس کے نتیجہ میں بے شمار ذاتی، خاندانی اور سماجی مسائل پیدا ہوتے تھے۔ قرآن میں یہ اصول مقرر کیا گیا کہ جس کو طلاق دینا ہو وہ عدت کے حساب سے طلاق دے اور اس عدت کا اہتمام کے ساتھ شمار کرے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دو طہروں کے اندر دو مہینوں میں ایک ایک بار طلاق دے۔ پھر تیسرے مہینہ کے تیسرے طہر میں اگر چاہے تو رجوع کرے اور چاہے تو دستور کے مطابق طلاق کو مکمل کر کے عورت کو رخصت کر دے۔ اس طرح ایک ناخوش گوار واقعہ، کوئی مزید خرابی پیدا کئے بغیر، اپنی فطری ترتیب سے آخری نوبت کو پہنچ جاتا ہے۔ نیز اس غیر عاجلانہ طریقہ کا یہ فائدہ بھی ہے کہ عورت اگر حاملہ ہے تو اس دوران میں اس کا حمل معلوم ہو جائے گا اور اس کی عدت وضع حمل تک مقرر کی جاسکے گی تاکہ جو شخص اس کے حمل کا سبب بنا ہے اس کے خرچ پر وہ اس کے گھر رہ کر وضع حمل کی مدت پوری کر سکے۔

جلد بازی کے بجائے اس طرح صبر اور انتظار کے اصول پر عمل کرنے کے بہت سے فائدے ہیں۔ اس دوران میں ہر دو فریق کے لئے ایسے نئے امکانات کھل جاتے ہیں جن کا ابتدائی وقت میں اندازہ نہیں کیا

جاسکتا تھا۔ اس طرح ایک خاندانی واقعہ اپنی فطری رفتار سے اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے کوئی غیر ضروری قسم کی پیچیدگی بھی پیدا نہیں ہوتی۔ عمل کا یہ انداز قرآن کے الفاظ میں بالغ الامر انداز ہے:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ ان اللہ بالغ امرہ قد جعل اللہ لکل شئ قدرا	اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے امر کو پورا کرکے رہتا ہے، اللہ نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔
(الطلاق ۳)	

یعنی جو شخص خدا کے مقرر کئے ہوئے طریقہ کو صحیح ترین طریقہ سمجھ کر اس پر اعتماد کرے گا اور صبر و انتظار کی تلخیوں کے باوجود اس کی پیروی میں اپنے معاملات انجام دے گا تو اس کی یہ روش اس کے معاملات کے حسن تکمیل کی ضمانت بن جائے گی۔ خدا تمام چیزوں سے آخری حد تک باخبر ہے اور اس نے انسان کے لئے کارکردگی کا جو ضابطہ طے کیا ہے اس میں تمام پہلوؤں کی کامل رعایت شامل ہے۔ اس نے اپنے علم کلی کے تحت ہر چیز کے عملدرآمد کا ایک انتہائی درست نظام مقرر کر دیا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو اس مقررہ نظام کی کامل پابندی کرے۔

خاموش تدبیر

قرآن میں کائناتی واقعات کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے: اللہ ہر کام کا انتظام کر رہا ہے اور وہ نشانیوں کو کھول کر بیان کرتا ہے (یدبر الامر یفصل الآیات، الرعد ۲) یعنی قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ قرآن میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ وہی ہیں جن پر خدا نے کائنات کو بالفعل قائم کر رکھا ہے۔ کائنات قرآن کی عملی تصدیق ہے۔ اس بات کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ قرآن جس ربانی حقیقت کا لفظی بیان ہے، بقیہ کائنات اسی کا عملی مظاہرہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اہل باطل کے مقابلہ میں اہل حق مضبوط بنیادوں پر اپنی تعمیر کریں۔ وہ اپنے وقت، اپنے مال اور اپنے طاقت ور کردار سے خدا کے دین کی عمارت کو اتنا مستحکم کر دیں کہ خدا کے دشمن اس کو ہلا نہ سکیں۔ خدا اپنے دین کو زمین پر غالب و سربلند دیکھنا چاہتا ہے اور یہ کام اہل ایمان کی جدوجہد اور قربانیوں ہی کے ذریعہ انجام پا سکتا ہے۔ قرآن میں ایک مثال مکڑی کے گھر کی دی گئی ہے (وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت، عنکبوت) دوسری مثال لوہے کی ہے (وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید، الحدید) بیت العنکبوت معمولی جھٹکے کو بھی سہار نہیں سکتا۔ مگر بیت الحدید کے مقابلہ میں بڑے بڑے طوفان بھی بے اثر ثابت ہوتے ہیں۔ اس طرح خدا نے دو عملی مثالوں کے ذریعہ بتایا کہ تم اپنے دین کا گھر مکڑی کے گھر کی طرح نہ بناؤ بلکہ لوہے کے گھر کی طرح بناؤ۔

مضبوط اور یقینی تعمیر کے لئے خدا کا جو طریقہ ہے اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ خاموش تدبیر کے ذریعہ دشمن کو بے زور کر دیا جائے اور اس کی جگہ حق کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس اصول کی وضاحت کے لئے یہاں دو آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

قد مکر الذین من قبلهم فاتی الله بنیانهم من القواعد فخر علیهم السقف من فوقهم و اتاهم العذاب من حیث لا یشعرون

(النحل ۱۶)

ان سے پہلے والوں نے تدبیریں کیں۔ پھر اللہ ان کی عمارت پر بنیادوں سے آگیا۔ پھر ان کی چھت اوپر سے ان پر گر پڑی اور ان پر عذاب وہاں سے آیا جہاں سے ان کو خیال بھی نہ تھا

هو الذی اخرج الذین کفروا من اهل الکتاب من دیارهم لاول الحشر ما ظننتم ان یخرجوا و ظنوا انهم مانعتهم حصونهم من الله فاتاهم الله من حیث لم یحتسبوا و قذف فی قلوبهم الرعب یخربون بیوتهم بایدیهم و ایدی المومنین فاعتبروا یا اولی الابصار

(الحشر ۲)

وہ اللہ ہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے منکروں کو ان کے گھروں سے نکال دیا اول حشر پر۔ تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خیال کرتے تھے کہ ان کے قلعے ان کو اللہ سے بچانے والے ثابت ہوں گے۔ پھر اللہ ان پر وہاں سے آگیا جہاں سے ان کو خیال نہ تھا۔ اس نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہاتھوں سے اجاڑنے لگے۔ اے آنکھ والو عبرت پکڑو

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا طریقہ یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ دشمن کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ یہ عمل اپنی تکمیل تک اس طرح جاری رہے کہ دشمن کو خبر نہ ہو اور اچانک ایک روز اس کی پوری چھت اس کے سامنے گر پڑے۔

خدائی طریق کار کے بارے میں قرآن میں کچھ مثالیں دی گئی ہیں۔ تاہم یہ علامتی مثالیں ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ ہم خدائی حکمت کو سمجھ جائیں اور دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں کہ چاروں طرف بکھری ہوئی نشانیوں سے سبق لیتے رہیں۔

مثال کے طور پر دیمک کو دیکھئے۔ دیمک انسان کا ایک دشمن کیڑا ہے۔ دیمک چیونٹی کی طرح چھوٹا ہونے کے علاوہ اتنا نازک ہوتا ہے کہ کھلی ہوا یا دھوپ میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مٹی کی نالی بنا کر چلتا ہے۔ اس کمزوری کے باوجود دیمک ہمیشہ انسان کو نقصان پہنچانے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ دیمک اتنی خاموشی کے ساتھ اپنا عمل کرتا ہے کہ انسان کو صرف اس وقت اس کی خبر ہوتی ہے جبکہ وہ اپنا کام کر چکا ہو۔ آپ کے کمرہ کا دروازہ اگر لکڑی کا ہے تو اس کے بازوؤں میں نہایت خاموشی کے ساتھ دیمک داخل

ہو جائے گی۔ وہ اندر ہی اندر لکڑی کو کھانا شروع کرے گی۔ بازوؤں کے اوپر آپ نے جو خوبصورت پالش کرا رکھی ہے اس کو کاغذ کی طرح چھوڑ دے گی۔ مزید یہ کہ وہ لکڑی کا جتنا حصہ کھائے گی اتنا ہی اس کے اندر مٹی بھرتی چلی جائے گی۔ اس طرح دیمک پوری لکڑی کھا ڈالے گی اور آپ کو اس کی خبر نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ وہ لکڑی کی اوپری پرت کو چھوڑ کر صرف اس کا اندرونی حصہ کھا رہی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ کھائے ہوئے حصہ میں مٹی بھرتی جاتی ہے جس کی وجہ سے لکڑی پولی نہیں ہوتی اور بدستور کھڑی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دیمک جب پورے بازو کو کھا جاتی ہے تو ایک روز آپ کا دروازہ بے جان ہو کر گر پڑتا ہے۔

دوسری طرف اسی دنیا میں ایک اور مثال ہے۔ یہ کتے کی مثال ہے۔ کتا بھی انسان کو کاٹنا چاہتا ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کو کاٹ پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتا آدمی کو دیکھ کر دور ہی سے بھونکنا شروع کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی چوکنا ہو کر اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتا ہے ——— دیمک اپنے مقصد میں ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے اور کتا اپنے مقصد میں ہمیشہ ناکام رہتا ہے۔ کتے کے حصہ میں صرف بھونکنا آتا ہے اور دیمک کے حصہ میں اپنے منصوبہ کو آخری حد تک مکمل کرنا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ دیمک خاموش تدبیر کے ذریعہ اپنا کام کرتا ہے۔ اور کتا شور و غل کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس طرح خدا دو زندہ نمونوں کے ذریعہ دکھا رہا ہے کہ اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ کیا ہے اور ناکامی کا طریقہ کیا۔

غیر عاجلانہ طریقہ

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان بے صبر اور جلد باز واقع ہوا ہے (بنی اسرائیل ۱۱) بلکہ جلد بازی ہی انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے (انبیاء ۳۷) صحیح طریقہ یہ بتایا گیا کہ اولعزمی کے ساتھ صبر و انتظار کا طریقہ اختیار کیا جائے، جلد نتیجہ دیکھنے کی خواہش نہ کی جائے (الاحقاف ۳۵) جلد بازی یہ ہے کہ کسی حاصل کو پانے کے لئے جو ابتدائی شرائط ضروری ہیں ان کی تکمیل کے بغیر قبل از وقت اس کو پانے کی کوشش کرنا۔ مثلاً چنار کا درخت اگر قدرتی طور پر سو سال میں مکمل ہوتا ہے تو آدمی یہ چاہے کہ وہ صرف چند سال میں مکمل درخت بن کر اس کے لئے کھڑا ہو جائے۔ اس قسم کی جلد بازی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ انسان کو یہ اختیار ضرور ملا ہوا ہے کہ وہ جلد بازی کا طریقہ اختیار کر کے اپنے وقت اور قوت کو ضائع کرتا رہے مگر خدا کے یہاں کسی واقعہ کے ظہور کے لئے جو فطری مدت مقرر ہے اس کو بدلنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ ضابطہ اتنا محکم ہے کہ اس میں پیغمبر تک کا کوئی استثناء نہیں، کسی واقعہ کے ظہور کے لئے وقت کی جو حد ہے اور کسی مقصود تک پہنچنے کے لئے جو طریقہ مقرر ہے، اس کی خلاف ورزی لازمی طور پر نقصان کا سبب بنے گی، خواہ یہ خلاف ورزی پیغمبر کی طرف سے ہوئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک واضح مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہے۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے ساتھ جب صحرائے سینا میں پہنچے تو خدا نے ان کے لئے ایک ماہ کی مدت مقرر کی اور فرمایا کہ تم طور پہاڑ پر آکر ۴۰ دن ذکر اور عبادت میں گزارو۔ اس کے بعد ذی الحجہ کی دس تاریخ کو تمھیں شریعت دی جائے گی۔ اس اعتبار سے حضرت موسیٰ کو ۱۰ ذی قعدہ کو طور پر پہنچنا چاہئے تھا۔ مگر وہ دس دن پہلے یکم ذی قعدہ کو طور پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا اے موسیٰ، تم اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی کیوں چلے آئے۔ موسیٰ نے کہا کہ وہ لوگ میرے پیچھے ہیں اور میں جلدی اس لئے آگیا تاکہ تو مجھ سے راضی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تمھاری قوم کو تمھارے پیچھے ایک فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے اس کو بہکا دیا (طہ ۸۵ ـ ۸۳)

حضرت موسیٰ کو جلد طور پر پہنچنے کا شوق ہوا۔ وہ بنی اسرائیل کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے بھائی ہارون کے سپرد کر کے وقت سے دس دن پہلے پہاڑ پر چلے گئے۔ حضرت موسیٰ کا یہ فعل تمام تر رضائے الٰہی کے جذبہ سے تھا۔ مگر وہ قوم کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا۔ قوم کی قیادت ابھی تک حضرت موسیٰ کر رہے تھے، اس کے اجتماعی نظم پر حضرت ہارون کی گرفت ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ حضرت موسیٰ قبل از وقت اس سے علیحدہ ہو کر پہاڑ پر چلے گئے۔ چنانچہ قوم کے مفسدین نے ابھر کر غلبہ پالیا اور قوم کو بچھڑے کی پرستش میں مبتلا کر دیا۔ یہ عجلت اگرچہ نبی کی طرف سے ظاہر ہوئی تھی اور خالص اللہ کی خوشنودی کے لئے تھی۔ مگر نہ تو اللہ نے ایسا کیا کہ وہ مقررہ تاریخ سے پہلے حضرت موسیٰ کو توراۃ کی تختیاں حوالے کر دے اور نہ ایسا ہوا کہ اخلاص اور نیک نیتی کی بنا پر وہ نتیجہ نہ نکلے جو ازروئے حقیقت نکلنا مقدر تھا۔

تدریجی اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان کے لئے صلاح و فلاح کا جو نظام لے کر آئے تھے اس میں شراب کی حرمت بھی مطلوب کے درجہ میں شامل تھی۔ مگر آپ نے اپنی نبوت کے تقریباً نصف عرصہ تک اس معاملہ کا کوئی ذکر نہیں چھیڑا۔ عملاً لوگوں کو ان کے حال پر رہنے دیا، صرف توحید اور آخرت کی باتوں سے لوگوں کے دلوں کو نرم کرتے رہے۔

شراب کے متعلق پہلا حکم آیا تو اس میں صرف ناپسندیدگی کا اظہار کر کے چھوڑ دیا گیا تاکہ ذہنوں کو اس کی حرمت قبول کرنے کے لئے تیار کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا: لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان چیزوں میں بڑی خرابی ہے اور ان میں لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں (البقرہ ۲۱۹) اگرچہ اس وقت لوگوں کے ذہنوں میں شراب کا حکم جاننے کے لئے سوال پیدا ہونے لگا تھا، اس کے باوجود اس کی بابت واضح حکم لوگوں کو نہیں بتایا گیا۔

اس کے بعد ۳ھ میں شراب کے متعلق دوسرا حکم آیا۔ مگر اب بھی اس کی مکمل ممانعت نہیں کی گئی۔ ایک ایسی

بات کہی گئی جس سے شراب کا ناپاک ہونا واضح ہوتا تھا اور شراب نوشی کے اوقات پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ یعنی یہ کہ نشہ کی حالت میں خدا کی عبادت کرنے کی ممانعت۔ حکم ہوا کہ اے ایمان والو، جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تک ایسا نہ ہو کہ جو کچھ تم نماز میں کہتے ہو اس کو سمجھنے لگو (النساء ۴۳)

مذکورہ حکم کے کچھ مدت بعد شراب کی مکمل حرمت نازل ہوئی۔ قرآن میں ارشاد ہوا: اے ایمان والو، شراب اور جوا اور آستانے اور پانسے سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے پرہیز کرو۔ امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔ شیطان یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ وہ تمھارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تم کو خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے (المائدہ ۹۱ ـ ۹۰) اب لوگوں کے ذہن تیار ہو چکے تھے۔ چنانچہ یہ آیت آتے ہی لوگ کہہ اٹھے: انتهينا ربنا انتهينا ربنا (اے ہمارے رب ہم باز آئے، اے ہمارے رب ہم باز آئے) اور شراب کے ذخیروں کو زمین پر بہا دیا۔

شراب کی حرمت کے متعلق جو حکمتِ تدریج اختیار کی گئی اس کے بارے میں حضرت عائشہ رضی کی ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے:

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى اذا ثاب الناس الى الاسلام نزل الحلال والحرام۔ ولو نزل اول ما نزل لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابدا ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابدا (بخاری باب تاليف القرآن)

قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہو گئے تو حرام و حلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے۔

استحکام کے بعد اقدام

عرب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ حرم کو ہر قسم کی مشرکانہ آلائشوں سے پاک کرکے اس کو دوبارہ خالص توحید کا مرکز بنا دیں۔ جیسا کہ وہ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے زمانہ میں تھا۔ آپ کی بعثت کے وقت صورت حال یہ تھی کہ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مشرک لوگ اپنے بیہودہ عقائد کے تحت کعبہ کا ننگا طواف کرتے تھے۔ کبیسہ کا اصول اختیار کرکے انھوں نے حج کی ابراہیمی تاریخوں کو بدل دیا تھا۔

اپنی نبوت کے ابتدائی دور میں آپ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے مگر آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر مکہ کی گلیوں میں احتجاجی جلوس نکالیں یا موقع پاکر حرم کے بتوں کو توڑنا شروع کر دیں۔ آپ صرف نظریاتی طور پر توحید و آخرت کی دعوت دیتے رہے مگر بتوں کے خلاف کسی قسم کے عملی اقدام سے مطلق پرہیز کیا۔

روایات بتاتی ہیں کہ ۸ھ میں جب مکہ فتح ہوگیا اور عرب کا مرکز اقتدار آپ کے قبضہ میں آگیا اس وقت آپ اپنی اونٹنی پر سوار ہوکر مکہ میں داخل ہوئے اور کعبہ کے گرد طواف کرنا شروع کیا۔ اس وقت کعبہ کے چاروں طرف ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ آپ اس چھڑی سے ایک ایک بت کو ٹھوکر دے رہے تھے اور بت زمین پر گرتے جاتے تھے۔ اس طرح تمام بت اوندھے منھ زمین پر گر پڑے اور اس کے بعد انھیں توڑ کر پھینک دیا گیا، جب آپ ایسا کر رہے تھے اُس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی: جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا (بنی اسرائیل ۸۱)

حرم کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا اول دن سے مطلوب تھا۔ مگر اقتدار کے حصول سے پہلے آپ نے بتوں کو بالکل نہیں چھیڑا۔ آپ صرف شرک کی تردید اور توحید کے اثبات پر اپنی ساری دعوتی مہم کو مرتکز کرکے چلاتے رہے۔ حرم کو عملاً بتوں سے صاف کرنے کی طرف اقدام آپ نے صرف اس وقت کیا جب کہ مکہ پوری طرح آپ کے زیر اقتدار آگیا اور وہاں آپ کی کسی کارروائی کے خلاف مزاحمت کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

اقتدار کے باوجود حکمت کا لحاظ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو عرب میں یہ رواج تھا کہ لوگ ننگے ہوکر کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کعبہ مقدس ترین جگہ ہے۔ اس لئے ہر قسم کی دنیوی آلائشوں، حتیٰ کہ کپڑے سے بھی پاک ہوکر اس کا طواف کرنا چاہئے۔ یہ ایک انتہائی بری رسم تھی اور یقینی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے حد ناپسند تھی۔ مگر آپ بعثت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں رہے اور کبھی اس کے خلاف کوئی احتجاج نہیں کیا۔ قیام مکہ کے آخری دنوں میں جب کہ آپ کے پیرؤوں کی تعداد کئی سو ہو چکی تھی، آپ برہنہ طواف کو اشو بنا کر اس کے خلاف جلوس نکال سکتے تھے۔ مگر آپ نے اس قسم کی کسی بھی کارروائی سے مکمل پرہیز کیا۔

اس کے بعد تاریخ آگے بڑھی اور رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوگیا۔ مکہ قدیم عرب میں ملک کی قیادت کا مرکز تھا۔ مکہ پر قبضہ ملنے کا مطلب یہ تھا کہ پورا عرب آپ کے قبضہ میں آگیا۔ مگر اب بھی آپ نے برہنہ طواف کے خلاف کوئی اقدام نہیں فرمایا۔ فتح مکہ کے چار ماہ کے بعد حج کا موسم آیا تو مشرکین حسب معمول حج کی ادائگی کے لئے آئے اور پہلے کی طرح ننگے ہوکر کعبہ کا طواف کیا۔ مگر ان پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ مسلمانوں نے اپنے مطابق حج کے مراسم ادا کئے اور مشرکین نے اپنے مطابق

اس کے بعد اگلے سال (۹ھ) کا حج پڑا۔ یہ عرب میں اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد دوسرا حج تھا۔ مگر اس سال بھی مشرکین کو برہنہ طواف سے نہیں روکا گیا۔ مسلمانوں نے حضرت ابوبکر کی قیادت میں اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ البتہ دوسرے سال یہ مزید کارروائی کی گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور ہدایت کی کہ حج کے اجتماع میں لوگوں کے درمیان یہ اعلان کر دیں کہ اِس سال کے بعد آئندہ کوئی مشرک حج کے لئے مکہ نہ آئے اور نہ اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف کرے (لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، فتح مکہ کے باوجود، ۸ھ اور ۹ھ میں حج کے لئے مکہ نہیں گئے۔ آپ نے فرمایا کہ مشرکین آئیں گے اور ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتی لایکون ذلک، تفسیر ابن کثیر، سورۃ التوبہ) اقتدار حاصل ہو جانے کے باوجود آپ دو سال تک برہنہ طواف کو برداشت کرتے رہے اور خود حج کے لئے نہیں گئے۔ تیسرے سال (۱۰ھ) میں آپ نے ننگے طواف کو بالکل بند کر دیا اور اسی سال مکہ جا کر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

تبدیلی فطری رفتار سے

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے کعبہ کی تعمیر کے بعد حج کا جو نظام قائم کیا تھا وہ قمری سال کی بنیاد پر تھا۔ اس بنا پر حج کی تاریخ مختلف موسموں میں آتی تھی۔ کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ بعد کے زمانہ میں اہل مکہ نے دیکھا کہ اس فرق سے ان کی تجارتوں کو نقصان ہوتا ہے۔ حج کا موسم اہل مکہ کی خوش حالی کا اصل ذریعہ تھا۔ مگر قمری حساب کی بنا پر حج کا مختلف موسموں میں آنا اس راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب میں کھجور کے پکنے کا زمانہ گرمی کا زمانہ تھا۔ قدیم عرب میں گرمی کا زمانہ ایسا ہی تھا جیسے زرعی ہندستان میں چیت کا زمانہ۔ ان دنوں قبائل کے پاس پیسہ ہوتا تھا اور وہ سفر کرنے اور خریداری کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تھے۔ چنانچہ گرمیوں کا حج تجارتی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب رہتا تھا۔ اس کے برعکس جاڑوں کے حج بہت پھیکے ہوتے تھے۔ تجارتی چہل پہل ختم ہو جاتی تھی۔ اہل مکہ کے لئے ان کی دنیوی مصلحتیں دینی مصلحتوں کے اوپر غالب آگئیں۔ انھوں نے یہود و نصاریٰ سے نسئی یا کبیسہ (Intercalation) کا طریقہ سیکھا اور حج کو ہمیشہ گرمی میں کرنے کے لئے قمری مہینوں کو ہٹا کر شمسی مہینوں کے مطابق کرنے کا اصول اختیار کر لیا۔

قمری سال کے مقابلہ میں شمسی سال تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لئے اہل مکہ یہ کرتے تھے کہ قمری سال میں ہر سال کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے تھے۔ اس تدبیر کے نتیجہ میں ایسا ہوتا تھا کہ ہر آٹھ سالوں میں تین مہینے بڑھ جاتے تھے۔ اس طرح ہر تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا تھا۔ قمری سال کو شمسی سال میں تبدیل کرنے کی یہ کارروائی حرام مہینوں میں (بشمول ذی الحجہ) کی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں یہ ہوتا کہ مہینے ۳۲ سال کے لئے اپنی جگہ سے ہٹ جاتے تھے اور اسی طرح حج کا

موسم بھی ۔ ۳۳ سال کی گردش کے بعد پھر یہ مہینے ایک مرتبہ کے لئے اپنی اصل جگہ پر واپس آتے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ذمہ داری تھی کہ حج کے معاملہ میں اس جاہلانہ رسم کو بدلیں اور حج کی تاریخوں کو ابراہیمی سنت کے مطابق قمری ماہ (ذی الحجہ) میں مقرر کریں ۔ رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو آپ اس حیثیت میں ہو گئے کہ سابقہ رسم کے فوری طور پر ختم کئے جانے کا اعلان کر دیں ۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا ۔ جاہلی رسم کے مطابق ۸ھ اور ۹ھ کا حج ذی قعدہ میں پڑ رہا تھا ۔ اور ۱۰ھ کا حج (۳۳ سال پورے کر کے) ذی الحجہ میں ۔ اگر آپ چاہتے تو فتح مکہ کے بعد فوراً اعلان کر دیتے کہ اس سال آنے والا حج ابراہیمی سنت کے مطابق (ذی قعدہ کے بجائے) ذی الحجہ میں ادا کیا جائے گا ۔ مگر آپ نے عجلت سے کام نہیں لیا ۔ بلکہ دو سال انتظار فرمایا ۔ اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے اس کو برداشت کیا کہ دو سال تک حج کی ادائیگی ذیقعدہ کے مہینہ میں ہو ۔ اور تیسرے سال جب خود فطری رفتار کے مطابق حج کا موسم ذی الحجہ میں آجائے اس وقت اعلان کر دیں کہ اب آئندہ حج کی ادائگی اسی طرح ہو گی جس طرح اس سال ہو رہی ہے ۔

یہی بات ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے خطبہ (۱۰ھ) میں ان لفظوں میں فرمائی تھی :

ان الزمان قد استدار کہیأتہ یوم خلق اللہ السماوات والارض (تفسیر ابن کثیر)	زمانہ گردش کرتا ہوا اپنی اس حالت پر آگیا ہے جو زمین و آسمان کی تخلیق کے اعتبار سے اس کی اصل حالت ہے

روایات توڑے بغیر اصلاح

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات میں سے ایک غزوہ وہ ہے جس کو غزوۂ مُریسیع یا بنی المصطلق (۵ھ) کہا جاتا ہے ۔ آپ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار نے فوج جمع کی ہے اور مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے ۔ آپ نے بریدہ بن حصیب اسلمیؓ کو خبر لینے کے لئے بھیجا ۔ انھوں نے واپس آکر تصدیق کی کہ خبر صحیح ہے ۔ آپ نے بھی اپنی فوج تیار کی اور تیزی سے چل کر اچانک ان کے اوپر حملہ کر دیا ۔ وہ لوگ مقابلہ نہ کر سکے ۔ ان کے دس آدمی قتل ہوئے اور تمام مرد و عورت بوڑھے بچے گرفتار کر لئے گئے ۔ مال غنیمت میں دو ہزار اونٹ اور پانچ ہزار بکریاں ہاتھ آئیں ۔

جو لوگ گرفتار ہوئے وہ کل دو سو گھرانے تھے ۔ آپ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کر کے انھیں اسلام کی طرف مائل کریں ۔ مگر روایت کو توڑ کر آپ نے ایسا کرنا پسند نہیں فرمایا ۔ اس زمانہ کی روایت کے مطابق یہ تمام قیدی فوج کے افراد کی ملکیت تھے ۔ اگر آپ ان کی آزادی کا اعلان کرتے تو اس روایت کو توڑنا پڑتا ۔ آپ نے اس کی نہایت خاموش تدبیر اختیار فرمائی ۔

قبیلہ کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیوہ لڑکی جویریہ بھی گرفتار شدگان میں تھی ۔ تقسیم غنیمت کے وقت وہ

ثابت بن قیس انصاری کے حصہ میں آئیں۔ ثابت بن قیس نے ان سے مکاتبہ کا معاملہ کرنا چاہا یعنی اگر وہ اتنی رقم ادا کردیں تو وہ آزاد ہیں۔ جویریہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور آپ سے بطور امداد اتنی رقم چاہی جس کو دے کر وہ آزاد ہوسکیں۔ آپ نے فرمایا: کیا میں تم کو اس سے بہتر چیز بتاؤں۔ وہ یہ کہ میں تمھاری طرف سے کتابت کی رقم ادا کردوں اور تم کو آزاد کرکے اپنی زوجیت میں لے لوں۔ وہ راضی ہوگئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جویریہ کو آزاد کرکے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ جویریہ چونکہ قبیلہ کے سردار کی لڑکی تھیں اس لئے قبائلی رواج کے مطابق اب آپ پورے قبیلہ کے داماد ہوگئے۔ مہاجرین وانصار کو جب یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے جن لوگوں کو قیدی بنایا ہے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامادی کا رشتہ ہے تو ایسے لوگوں کو قید رکھنا انھیں شاق معلوم ہوا۔ انھوں نے تمام قیدیوں کو اپنی طرف سے رہا کردیا۔ ان قیدیوں کے دل اپنے "داماد" اور اس کے دین کے بارے میں پہلے ہی نرم ہو چکے تھے۔ جنگ میں شکست کے بعد آزاد کردیا جانا ان کو غیر معمولی طور پر متاثر کرنے کا ذریعہ بن گیا کیونکہ یہ ایسا سلوک تھا جس کا قدیم قبائلی دور میں تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کے جلد ہی بعد پورا قبیلہ مسلمان ہوگیا۔ اسی بنا پر حضرت عائشہ نے جویریہ کے بارے میں کہا: مجھے کوئی ایسی عورت نہیں معلوم جو جویریہ سے زیادہ اپنی قوم کے لئے بابرکت ثابت ہوئی ہو (ما اعلم امرأۃ کانت اعظم علیٰ قومہا برکۃ منہا، سیرۃ ابن ہشام)

موجودہ زمانہ کی تحریکیں

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے احیاء اسلام کے لئے بے شمار تحریکیں اٹھائیں۔ ان تحریکوں کو غیر معمولی مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ مگر اصل مقصود کو حاصل کرنے میں تمام تحریکیں ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان تحریکوں نے فطرت کے ضابطہ کو اختیار نہیں کیا۔ انھوں نے اس طریق کار کو نہیں اپنایا جو خدا نے ان کے لئے مقرر کیا تھا اور جس کا عملی نمونہ قائم کرکے انھیں دکھا دیا تھا۔

ان تحریکوں نے خاموش تدبیر کے بجائے شور وغل کے ذریعہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے فطری رفتار سے چلنے کے بجائے عاجلانہ اقدام کرکے منزل تک پہنچنا چاہا۔ انھوں نے تدریج کے بجائے چھلانگ کا طریقہ اختیار کیا۔ وہ اپنی پوزیشن کو مستحکم کئے بغیر بڑی بڑی کارروائیاں کرنے لگے۔ انھوں نے حکمت کے بجائے شوق اور جذبات کو اپنا رہنما بنایا۔ انھوں نے بنیاد کا کام کئے بغیر اپنی آرزوؤں کا محل کھڑا کرنا شروع کردیا۔ تھوڑے سے زیادہ کی طرف بڑھنے کے بجائے انھوں نے چاہا کہ پہلے ہی دن انھیں زیادہ حاصل ہوجائے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ ناکامی تھا اور وہی ان کے حصہ میں آیا۔

خدا کی دنیا میں خدا کے مقررہ ضابطہ پر چل کر ہی کامیابی ہوسکتی ہے۔ کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے

کے بعد خدا کی دنیا میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔ خدا نے اپنی دنیا میں کامیابی کا راز اگر صبر میں رکھا ہے تو آپ اس کو جلد بازی کے ذریعہ حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اگر ایک واقعی نتیجہ کو خاموش جدوجہد سے وابستہ کر دیا ہے تو آپ تقریروں اور بیانات کی دھوم مچا کر اس نتیجہ کو اپنے لئے برآمد نہیں کر سکتے۔ خدا نے کوششوں کا حاصل پانے کے لئے اگر ایک مدت مقرر کر دی ہے تو آپ مدت کی تکمیل سے پہلے اس حاصل کے مالک نہیں بن سکتے۔ خدا نے اگر اپنی دنیا میں نتیجہ خیز عمل کے لئے تدریج کا اصول مقرر کیا ہے تو آپ چھلانگ لگا کر اچانک اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ خدا اگر چاہتا ہے کہ ضروری استحکام کے بغیر کوئی اقدام نہ کیا جائے تو آپ استحکام کے بغیر اقدام کر کے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ خدا نے اس دنیا کے مسائل کا حل اگر حقیقت پسندانہ طریق عمل میں رکھا ہے تو آپ جذباتیت کے طریقہ پر چل کر اپنے مدعا کو نہیں پا سکتے۔ خدا نے اگر افراد کے اندر کردار کی تعمیر میں قومی اصلاح کا راز رکھا ہے تو آپ اجتماعی ہنگاموں سے قومی اصلاح کے مقصد تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہ خدا کا قانون ہے اور خدا کے قانون میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

اسلام اور سائنس

ایک بار میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جنھوں نے سائنس میں ڈگری لی تھی اور اسی کے ساتھ انھوں نے مذہب اور تاریخ کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ خدا اور مذہب کو نہیں مانتے تھے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے کہا: اسلام کو اگر تاریخ سے نکال لیا جائے تو انسانی تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔ میں نے کہا: وہی کمی جو اسلام سے پہلے انسانی تاریخ میں تھی۔

زمین پر انسان ہزار ہا سال سے آباد ہے۔ مگر معلوم تاریخ کے مطابق اسلام سے پہلے کسی بھی دور میں انسان کی رسائی اس شعبۂ فن تک نہ ہو سکی جس کو آج سائنس کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ بہت سادہ ہے۔ اسلام سے پہلے ہر دور میں انسان کے اوپر شرک کا غلبہ تھا۔ یہی شرک عالم فطرت پر تحقیق کرنے میں مانع تھا۔ کیونکہ شرک کے عقیدہ کے تحت فطرت کے مظاہر پوجنے کی چیز بنے ہوئے تھے، جب کہ سائنس کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب کہ ان مظاہر کو تحقیق و تسخیر کی چیز سمجھا جائے۔ مشرک انسان چاند کو دیوتا سمجھتا تھا، اس لئے اس کا ذہن اس رخ پر چل ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ چاند پر اپنے قدم رکھے۔ وہ سیلاب کو خدا کا جزء سمجھتا تھا، اس لئے اس کے لئے یہ سوچنا ممکن نہ تھا کہ سیلاب کو قابو میں لا کر اس سے بجلی پیدا کرے۔ اسلام نے معلوم تاریخ میں پہلی بار شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا۔ بالفاظ دیگر، اس ذہن کو فروغ دیا کہ خدا صرف ایک ہے، باقی تمام چیزیں مخلوق ہیں۔ اس طرح اسلام نے عالم فطرت کی تحقیق کا راستہ کھولا۔ اور بالآخر وہ تمام ترقیاں وجود میں آئیں جو قدرت پر فتح کے نتیجہ میں انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم سائنسی پس ماندگی شرک کا بالواسطہ نتیجہ تھی اور جدید سائنسی ترقی توحید کا بالواسطہ نتیجہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام اس لئے نہیں آیا کہ وہ دنیا کو سائنس دے۔ مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر اسلام نہ آتا تو سائنسی ترقیوں کا دروازہ انسان کے اوپر بند رہتا، جیسا کہ اس سے پہلے وہ انسان کے اوپر بند پڑا ہوا تھا۔ سائنسی تحقیق اور ترقی کے سلسلے میں توحید کی اس اہمیت کو آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ - ۱۸۸۹) نے کھلے لفظوں میں تسلیم کیا ہے (ظہور اسلام، صفحہ ۱۴۶)

سائنس اسلامی انقلاب سے پیدا ہوئی

توحید کی بنیاد پر جو فکری انقلاب آیا اس کے بہت سے نتائج میں سے ایک نتیجہ یہ تھا کہ انسان عالم فطرت کو اس نظر سے دیکھنے لگا کہ وہ بے بس مخلوق ہے اور انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کو جانے اور اس کو اپنے کام میں لائے۔ اس ذہن کا آغاز اموی دور (۷۵۰ - ۶۶۱ ء) میں دمشق میں ہوا۔ قدیم یونانی حکماء کے یہاں کیمیا چاندی سے سونا بنانے کے خبط کا نام تھا۔ خالد بن یزید بن معاویہ غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے کیمیا کو ایک طبیعی علم کی حیثیت سے ترقی دینے کی کوشش کی۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں اس شعبۂ علم نے بغداد میں مزید فروغ پایا اور اسپین اور سسلی تک پھیلتا چلا گیا۔ اس زمانہ میں مسلمان علمی اور تمدنی ترقی میں دنیا کی تمام قوموں سے آگے بڑھے

ہوئے تھے۔ تاریخ کے اس دور کو یورپ کے مورخین تاریک دور (Dark Ages) کہتے ہیں۔ مگر وہ صرف یورپ کے لئے تاریک تھا نہ کہ مسلم دنیا کے لئے۔ ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا کا مقالہ نگار "ڈارک ایجز" کے عنوان کے تحت لکھتا ہے:

The term 'dark ages' cannot be applied to the splendid Arab culture which spread over north Africa and into Spain. (P. 30)

تاریک دور کی اصطلاح شاندار عرب کلچر پر چسپاں نہیں ہوتی جو اس زمانہ میں شمالی افریقہ اور اسپین میں پھیلا ہوا تھا۔

شرک کس طرح سائنسی تحقیق میں رکاوٹ تھا، اس کی وضاحت کے لئے یہاں ہم ایک مثال نقل کریں گے۔

قدیم یونان میں زمین اور سورج کی گردش کے بارے میں دو نظریے پیش کئے گئے تھے۔ ایک تھا ارسٹارکس کا نظریہ جس میں زمین کو سورج کے گرد گھومتا ہوا فرض کیا گیا تھا۔ دوسرا ٹالمی کا نظریہ جس کے مطابق سورج زمین کے گرد گھوم رہا تھا۔ پہلے نظریہ کے مطابق زمین بظاہر گول تھی اور دوسرے نظریہ میں چپٹی۔ قسطنطین (۳۳۷ - ۲۷۲) کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد جب مسیحیوں کو یورپ میں غلبہ ہوا تو انھوں نے ٹالمی کے نظریہ کی سرپرستی کی اور دوسرے نظریہ کو بزور دبا دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت نے حضرت مسیح کو خدا فرض کر لیا تھا اس عقیدہ کے مطابق زمین کو یہ تقدس حاصل تھا کہ وہ خداوند کی جنم بھومی ہے۔ اور جو کرہ خداوند کی جنم بھومی ہو وہ کسی دوسرے کرہ کا تابع (Satellite) کس طرح ہو سکتا تھا۔ زمین کو اس طرح مقدس سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بارے میں تحقیقی کام آگے نہ بڑھ سکا۔ مشرکانہ مذہب اور سائنس کے درمیان ٹکراؤ کی مزید تفصیلی مثالیں ڈریپر (۱۸۱۱–۱۸۸۲) کی کتاب مذہب اور سائنس کا تصادم (Conflict between Science and Religion) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عباسی خلیفہ المامون (۷۸۶ - ۸۳۳) کے زمانہ میں بیت الحکمت قائم ہوا اور حکومت کے خصوصی تعاون کے تحت دونوں قسم کے ترجمے عربی زبان میں کئے گئے۔ مسلمانوں نے جب اعتقادی پیچیدگی سے آزاد ہو کر دونوں نظریات کو جانچا تو ان کو پہلا نظریہ حقیقت سے قریب تر نظر آیا۔ خلیفہ المامون جو خود بھی بہت بڑا عالم تھا، اس نے اس مسئلہ کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے ہیئت و جغرافیہ کے عالموں کو حکم دیا کہ وہ زمین کو گول فرض کرتے ہوئے اس کا محیط (Circumference) معلوم کریں اور اس کے لئے کسی کھلے میدان میں ایک زمینی درجہ (Terrestrial Degree) کی لمبائی کی پیمائش کریں اور اس کے بعد اس سے زمین کی پوری گولائی کا اندازہ کریں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے پاس آلات حساب کے نام سے صرف زاویہ ناپنے کا سادہ آلہ (Quadrant) اصطرلاب، دھوپ گھڑی اور معمولی گلوب تھے۔ اس قسم کی چند چیزوں کے ذریعہ انھوں نے اپنی جدوجہد شروع کر دی۔

اس مقصد کے لئے سنجار (Palmyra) کا وسیع ہموار میدان منتخب کیا گیا۔ ایک مقام پر قطب شمالی کی بلندی کے ساتھ زاویہ قائم کر کے شمال کی جانب جریب سے ناپنا شروع کیا۔ ۵۶ ⅔ میل شمال کی جانب جانے سے قطب شمالی کی بلندی کے زاویہ میں ایک درجہ کی لمبائی بڑھ گئی۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ جب ایک درجہ کی مسافت سطح زمین پر

۵۶ ۲/۳ میل ہے تو زمین کا کل محیط (Circumference) ۲۰ ہزار میل سے زیادہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ ہر نقطہ پر تمام زاویوں کا مجموعہ ۳۶۰ درجہ ہوتا ہے۔ اور ۳۶۰ کو ۵۶ ۲/۳ میں ضرب دینے سے ۲۰۴۰۱ میل کا فاصلہ برآمد ہوتا ہے۔ دوبارہ یہی تجربہ دریائے فرات کے شمال میں صحرائے کوفہ میں کیا گیا اور دوبارہ وہی نتیجہ نکلا ———
یہ پیمائش حیرت انگیز طور پر قریب بہ صحت تھی۔ کیونکہ موجودہ زمانہ میں صحیح ترین پیمائش کے مطابق زمین کا محیط خط استوار پر ۲۵ ہزار میل ہے۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی سائنسی ترقی کی تفصیلات پروفیسر فلپ ہٹی (۱۸۸۶ —) کی کتاب تاریخ عرب (History of the Arabs) میں دیکھی جاسکتی ہے (۳۷۵)

سائنس کی مسلم دنیا سے علیحدگی

علم کے مختلف میدانوں میں یہ ترقیاں جاری تھیں کہ باہمی اختلافات کے نتیجہ میں عرب خلافت کا نظام ٹوٹ گیا۔ اور اسلام کا جھنڈا عثمانی ترکوں (۱۵۱۷ — ۱۹۲۴) نے سنبھالا۔ اس طرح سولھویں صدی عیسوی میں اسلام کی سیاسی نمائندگی کا مرکز عرب سے نکل کر ترکی کی طرف منتقل ہوگیا۔ یہاں سے تاریخ میں ایک نیا انقلاب آیا جس نے واقعات کے رخ کو بالکل دوسری طرف موڑ دیا۔

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایک شخص جو کسی پہلو سے مفید خدمت انجام دیتا ہے، وہی کسی دوسرے پہلو سے بہت بڑی مصیبت کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی ایک واضح مثال اموی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک کی ہے۔ اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے خلفاء راشدین کی فہرست میں پانچویں خلیفہ راشد (عمر بن عبدالعزیز) کا اضافہ کیا۔ مگر مورخ اسی خلیفہ کے تذکرہ میں اس ہیبت ناک غلطی کو بھی لکھتا ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے انتہائی اہم فوجی سرداروں کو ختم کرادیا۔ جس کا نقصان یہ ہوا کہ ایشیا اور افریقہ میں اسلام کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی اچانک ٹھپ ہوکر رہ گئی۔

یہی صورت عثمانی ترکوں کے ساتھ پیش آئی۔ ترکوں نے عین اس وقت اسلام کا جھنڈا سنبھال لیا جب کہ کمزور ہاتھوں میں پہنچ کر اس کے گرنے کا اندیشہ پیدا ہوگیا تھا۔ وہ کئی سو سال تک یورپ کی مسیحی طاقتوں کے مقابلہ میں اسلام کی دیوار بنے رہے۔ اس اعتبار سے ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہی ترک ہیں جو اس حادثہ کا باعث بنے کہ مسلم دنیا میں ہونے والی سائنسی تحقیقات رک جائیں اور ان کا مرکز یورپ کی طرف چلا جائے۔
ترک انتہائی بہادر اور حوصلہ مند تھے۔ مگر ان کی کمزوری یہ تھی کہ وہ جاہل تھے۔ علمی تحقیق کے کام کی اہمیت نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ نہیں سکتے تھے بلکہ وہ اس کو اپنے لئے ایک سیاسی خطرہ خیال کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ علم کے بڑھنے سے رعایا میں ان کے حق میں وفاداری کم ہوجائے گی اور ان کو قابو میں رکھنا نسبتاً زیادہ مشکل ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علمی کام کے ساتھ سخت غیر رواداری کا ثبوت دیا۔ جب مسلم سیاست کا مرکز بدلا تو وہ لوگ جو بغداد اور دوسرے مراکز میں سائنس کی تحقیق کا کام کر رہے تھے، وہ منتقل ہوکر ترک دارالسلطنت آستانہ میں جمع ہوگئے۔ عباسی خلفاء ان لوگوں کی بے حد قدردانی کرتے تھے۔ انھوں نے ان کے اوپر درہم و دینار کی بارش کر رکھی تھی۔ مگر ترک ان کو اپنے لئے خطرہ سمجھ کر ان سے نفرت کرنے لگے۔ انھوں نے ان کی اس قدر حوصلہ شکنی کی کہ ترک حکومت میں ان کو اپنا

مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ یہ لوگ ترکی چھوڑ کر اٹلی اور فرانس جانا شروع ہوگئے۔ سائنسی تحقیق کا کام مسلم دنیا سے نکل کر مغربی دنیا میں منتقل ہوگیا۔ ترکوں نے علم اور اہل علم کی جس طرح حوصلہ شکنی کی اس کی دردناک تفصیل محمد کرد علی شامی کی کتاب تاریخ الحضارۃ العربیہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مغربی دنیا میں ان سائنس دانوں کی زبردست پذیرائی ہوئی۔ صلیبی جنگوں (۱۰۹۵–۱۲۷۱) میں مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپی قوموں کو شکست اس لئے ہوئی تھی کہ مسلمان علم وفن میں ان سے بڑھے ہوئے تھے۔ ان جنگوں میں ابتداءً رومی فوجوں نے یونانی آگ (Greek Fire) استعمال کی جس سے مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا۔ "یونانی آگ" ایک قسم کی پچکاری تھی جس میں آتش گیر کیمیائی مرکب بھر کر دشمن کی طرف پھینکا جاتا تھا۔ مسلم سائنس دانوں نے اس کے مقابلہ میں ایک اور چیز ایجاد کی۔ اس میں روغن نفط (معدنی تیل) استعمال ہوتا تھا۔ اس کی مار زیادہ دور تک تھی اور اس کا نقصان بھی یونانی آگ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔

یورپ کے مسیحی قدرتی طور پر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی علمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لئے بیتاب تھے۔ اب جو مسلم دنیا کے اہل علم ان کے یہاں پہنچے تو انھوں نے ان کے ساتھ زبردست تعاون کیا۔ یورپ میں علمی تحقیق کا وہ کام دگنی شدت کے ساتھ ہونے لگا جو اس سے پہلے مسلم دنیا میں ہو رہا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی تک، تقریباً تین سو سالہ عمل کے نتیجہ میں یورپ میں وہ انقلاب آیا جس کو سائنسی اور صنعتی انقلاب کہا جاتا ہے۔

مغرب کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کے حصہ کے بارے میں مزید تفصیل بریفالٹ کی کتاب تعمیر انسانیت (Making of Humanity) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

سولھویں صدی تک مسلمان علم کے میدان میں استادی کے مقام پر تھے۔ مگر اس کے بعد کی صدیوں میں یورپ نے جو ترقیاں کیں اس نے مسلمانوں کو شاگردی کے مقام پر پہنچا دیا۔ مسلمان خود اپنی لائی ہوئی انقلابی دنیا میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ تاہم اب بھی یہ موقع تھا کہ وہ یورپ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر آگے بڑھیں اور وہ واقعہ دوبارہ نئی شکل میں ظہور میں آئے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں یورپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مسلمانوں کے علوم کو بنیاد بنا کر یورپ ان سے آگے بڑھ گیا تھا۔ اب مسلمان یورپ کے علوم کو لے کر مزید آگے کی ترقیاں حاصل کر سکتے تھے۔ مگر یہاں دو خاص وجہیں راستہ میں حائل ہوگئیں۔ ایک تاریخی امکان واقعہ بننے سے رہ گیا۔

سائنس کے معاملہ میں موجودہ مسلمانوں کی غفلت

۱۔ صدیوں تک سائنسی علوم سے دور رہنے کے بعد یورپ کے ذریعہ جب سائنس مسلمانوں کی طرف آئی تو وہ صرف ایک علم کے طور پر نہیں آئی۔ بلکہ وہ ملک گیری اور استعمار کے جلو میں آئی۔ مسلمانوں کے پاس یہ سائنس لے کر وہ لوگ آرہے تھے جنھوں نے مسلمانوں سے ان کی عظمت اور ان کے اقتدار کو چھینا تھا۔ ان کی تہذیب اور ان کے مذہبی شعائر پر حملے کئے تھے۔ اس موقع پر مسلمان اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے کہ وہ مغربی سائنس کو مغربی سیاست سے الگ کر کے دیکھیں۔ انھوں نے دونوں کو ایک سمجھا۔ وہ جس طرح مغربی قوموں کے دشمن بنے، اسی طرح

وہ مغربی علوم کے بھی دشمن بن گئے۔ جب کہ دوسری قومیں مغرب سے ان کے علوم سیکھ رہی تھیں، مسلمان ان کو دشمن کی چیز سمجھ کر ان سے دور بھاگ رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے کم از کم سو سال علم میں پیچھے ہو گئے، قوموں کے اوپر علمی امام بننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

۲۔ مزید نقصان یہ ہوا کہ طویل غفلت کے بعد مسلمانوں میں جو لوگ علم کے مبلغ بن کر اٹھے وہ اس کام کے پوری طرح اہل نہ تھے۔ انھوں نے ایک صحیح کام کو غلط طریقہ سے انجام دینے کی کوشش کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں ان کو وہ قبولیت حاصل نہ ہو سکی جو باعتبار حقیقت انھیں حاصل ہونی چاہئے تھی۔

مثال کے طور پر علم جدید کی اہمیت ثابت کرنے کے لئے انھوں نے یہ کیا کہ قرآن و حدیث میں جہاں جہاں "علم" کا لفظ آیا ہے اس کو انھوں نے ان سیکولر علوم کا مصداق بتایا جو آج یونیورسٹیوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک صحیح بات کے لئے غلط دلیل پیش کرنا تھا۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث میں جس علم کی فضیلت بیان ہوئی ہے اس سے مراد علم دین ہے نہ کہ سیکولر یا سائنسی علوم۔ ان علوم کو حاصل کرنا یقیناً مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ مگر ان علوم کی اہمیت آیتِ قوت سے ثابت ہوتی ہے نہ کہ آیتِ علم سے ۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اس قوت کو حاصل کرو جس سے تمھارے حریف کے اوپر تمھاری دھاک قائم ہو۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی علوم نے یہی مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے سائنسی علوم کا حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ سائنسی علوم میں دستگاہ حاصل کئے بغیر مسلمان آج کی دنیا میں قوت مرہبہ (انفال ۶۰) کے مالک نہیں بن سکتے، اس لئے اس قرآنی حکم کی تعمیل میں موجودہ حالات کے لحاظ سے یہ بات بھی شامل ہوگی کہ وہ ان علوم کو حاصل کریں اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی تقویت کا ذریعہ بنائیں۔

موجودہ زمانہ کے تعلیمی مصلحین کی اسی غلطی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کا دینی طبقہ ان کا سخت مخالف ہو گیا۔ طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم (حدیث) جیسی نصوص کا مطلب دینی طبقہ کے نزدیک متفقہ طور پر یہ تھا کہ اس سے مراد کتاب و سنت کا علم حاصل کرنا ہے۔ جب تعلیمی مصلحین نے اس طرح کی آیتوں اور حدیثوں کو موجودہ زمانہ کے "دنیاوی" علوم پر چسپاں کیا تو دینی طبقہ کو یہ بات سراسر اسلام کی تحریف نظر آئی۔ وہ اس کا دشمن بن کر کھڑا ہو گیا۔ تعلیمی مصلحین بلاشبہ غلطی پر تھے۔ مگر دینی نمائندوں سے بھی یہ غلطی ہوئی کہ وہ مقصد اور استدلال دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انھیں نظر آتا کہ تعلیمی مصلحین جن علوم کی اہمیت کو آیت علم سے غلط طور پر ثابت کر رہے ہیں وہ آیت قوت سے بالکل درست طور پر ثابت ہو رہی ہے۔ اس لئے اس معاملہ میں اصل کام استدلال کی تصحیح ہے نہ کہ خود مقصد کو باطل قرار دینا۔

اسلام میں سائنس کی اہمیت

اسلام میں سائنس کی اہمیت کے متعدد وجوہ ہیں۔ یہاں چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سائنس، سادہ طور پر، عالم حقائق کے مطالعہ کا نام ہے۔ قرآن میں یہی صفت اہل ایمان کی بتائی گئی ہے

کہ وہ زمین و آسمان کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں (یتفکرون فی خلق السماوات والارض، آل عمران ۱۹۱) اس اعتبار سے ایک سائنس داں وہی کام کرتا ہے جو ایک مومن کرتا ہے۔ تاہم دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ سائنس داں کا عمل صرف تحقیق کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا عمل عبرت کے لئے۔ سائنس داں کے پیش نظر علم برائے علم ہوتا ہے اور مومن کے پیش نظر علم برائے مقصد۔ سائنس داں اضافۂ علم پر مطمئن ہوتا ہے اور مومن اضافۂ ایمان پر۔

ذہن کا یہ فرق دونوں کے طرز مطالعہ میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنسداں اشیاء کی ماہیت کو چھوڑ کر صرف اشیاء کے خواص کے مطالعہ تک اپنے کو محدود رکھتا ہے۔ وہ اشیاء کی کارکردگی کو ان کی معنویت سے جدا کر دیتا ہے۔ سائنس داں کو ایسا اس لئے کرنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنی عقل کی رہنمائی میں کائنات کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اور انسان کی عقل قطعیت کے ساتھ صرف قابل تجربہ چیزوں کو دیکھ پاتی ہے، اس لئے اس کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ وہ کائنات کے قابل تجربہ پہلوؤں تک اپنے مطالعہ کو محدود رکھے۔ مگر مومن اپنی عقل کے ساتھ نبوت کی رہنمائی کو تسلیم کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس لئے وہ خواص اشیاء سے گزر کر حقائق اشیاء تک اپنے مطالعہ کو لے جاتا ہے۔ وہ "مخلوق" کو اس کے "خالق" کے ساتھ شامل کر کے دیکھتا ہے۔ یہ فرق مومن کے مشاہدۂ کائنات میں زبردست معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ اس کو ساری کائنات صفات خداوندی کا ظہور نظر آنے لگتی ہے۔ کائنات کو پاتے ہی وہ اس خدا کو بھی پالیتا ہے جس پر وہ پیغمبر کے واسطہ سے ایمان لایا ہے۔

۲۔ قرآن میں کائناتی واقعات کو قرآنی پیغام کے حق میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن میں جو بات نظری طور پر کہی گئی ہے، کائنات اس کے حق میں واقعاتی دلیل ہے۔ اس اعتبار سے پوری سائنس قرآن کا علم کلام ہے۔ کیونکہ سائنس کسی سائنس داں کے خود ساختہ علم کا نام نہیں بلکہ وہ خدا کی کائنات میں کام کرنے والے قوانین کی تلاش کا نام ہے۔ ان قوانین کا جو حصہ بھی سائنس دریافت کرتی ہے وہ خدا کی کارفرمائیوں کی ایک جھلک ہوتی ہے، وہ خدا کی آیتوں میں سے ایک آیت (نشانی) کا انسانی علم میں آنا ہوتا ہے۔ سائنس داں کے لئے سائنس علم برائے علم ہے یا زیادہ سے زیادہ علم برائے تعمیر دنیا۔ مگر مومن کے لئے سائنس ایک علمی ہتھیار ہے جس سے وہ دعوت حق کی جد وجہد میں کام لیتا ہے، جس سے وہ اپنی بات کو مدلل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔

۳۔ سائنس کا تیسرا پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے، وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا۔ یعنی وہ موجودہ زمانہ میں قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام اور مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سائنس کی قوت کو پوری طرح فراہم کیا جائے۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ مسلمان سائنس کی تحقیق و تحصیل میں آگے بڑھیں، حتیٰ کہ وہ اس میں امامت کا درجہ حاصل کر لیں۔

انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں ساری مسلم دنیا میں سیاسی آزادی کی تحریکیں اٹھیں۔ ان تحریکوں کے مسلم قائدین کا یہ خیال تھا کہ بیرونی سیاسی قبضہ سے آزاد ہونے کا نام غلبہ ہے۔ وہ سیاسی آزادی کو

اسلام کی سربلندی کے ہم معنی سمجھتے تھے۔ مگر آج جب کہ بے شمار قربانیوں کے بعد تمام مسلم ممالک آزاد ہو چکے ہیں، آج بھی وہ ان غیر مسلم قوموں کے محکوم ہیں جو سائنس اور ٹکنالوجی میں ان سے بڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی سیاسی آزادی ان کو آج کی دنیا میں برتری کا مقام نہ دے سکی۔ کیونکہ وقت بتانے والی گھڑی سے لے کر جنگ لڑنے والے سامان تک ہر چیز کے لئے وہ انھیں قوموں کے محتاج ہیں، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہر چیز کا تعلق سائنس اور ٹکنالوجی سے ہوگیا ہے۔ اس لئے جو قوم ان چیزوں میں پیچھے ہو وہ مقابلہ کی اس دنیا میں آگے کی صف میں جگہ نہیں پا سکتی۔ سائنسی علوم میں مسلمانوں کی اس پس ماندگی ہی نے غیر اسلامی طاقتوں کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ مسلم قوموں کی ٹکنکل مدد کر کے ان کو جتھوں میں بانٹیں اور ان کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتی رہیں۔

نئی دہلی میں جنتر منتر روڈ سے گزرنے والا ایک عجیب وغریب طرز کی عمارت دیکھتا ہے جس کا نام "جنتر منتر" ہے۔ اسی کے اوپر سڑک کا نام جنتر منتر روڈ رکھا گیا ہے۔ جنتر منتر دراصل پرانے زمانہ کی رصد گاہ ہے جس کو اٹھارویں صدی کے نصف اول میں جے پور کے راجہ جے سنگھ نے بنوایا تھا۔ جے سنگھ کو علم فلکیات کا بہت شوق تھا۔ ہندوستان کے اس راجپوت راجہ نے اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے صرف جے پور میں ہی ایک بڑی رصد گاہ نہیں بنوائی بلکہ دہلی، متھرا، بنارس اور اجین میں بھی رصد گاہیں تعمیر کرائیں۔ دہلی کا جنتر منتر آج بھی راجہ کے اس شوق کی یاد دلاتا ہے۔

ان رصد گاہوں کے ذریعہ اس دور کے علمائے فلکیات چاند اور ستاروں کی رفتار معلوم کرتے تھے۔ ان رصد گاہوں کے ذریعہ موسم کا پتہ چلایا جاتا تھا۔ وہ اس کی مدد سے ستاروں اور زمین کا فاصلہ ناپتے تھے۔ رات کو چاند کی روشنی اور دن کو سورج کی روشنی کی مدد سے وقت کا اندازہ کرتے تھے۔ عمارت کی کھڑکیاں، دریچے اور دیواروں کے سوراخ خود بخود سال کا پورا کیلنڈر ترتیب دے دیتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں ساری دنیا کا علمی اور تعمیری کام مسلمانوں کی علمی اور تعمیری ترقیوں کی نقل ہوتا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ جے سنگھ کی یہ رصد گاہ بھی عباسی رصد گاہوں کی نقل تھی۔ وہ ٹھیک اس انداز سے بنائی گئی تھی جیسی خلیفہ مامون رشید نے ایک ہزار سال پہلے بغداد میں بنوائی تھی۔

قدیم دور میں علم کی امامت مسلمانوں کو حاصل تھی۔ چنانچہ ساری دنیا میں ان کے طریقوں کی تقلید کی جاتی تھی۔ مگر بعد کے زمانہ میں ان کی غفلت سے امامت کا یہ مقام مغربی قوموں نے حاصل کر لیا۔ تین سو سال پہلے جب ایک شخص فلکیات کے مطالعہ کے لئے "رصد گاہ" بنانا چاہتا تو وہ بغداد کے نمونہ کی نقل کرتا تھا۔ مگر آج جب کسی ملک میں "رصد گاہ" تعمیر کی جاتی ہے تو اس کا نقشہ اور سامان مغرب کے ماہرین سے حاصل کیا جاتا ہے ــــــــ یہی وہ مقام ہے جہاں مسلمانوں کی عزت وسربلندی کا سفر ختم ہوا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمان دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر سکتے ہیں۔

جدید معقولات

جدید معقولات کا مطلب ہے جدید ذہن کی رعایت سے دین کی باتوں کو مدلل کرنا، جدید طرز استدلال میں اسلامی تعلیمات کو بیان کرنا۔ اب دیکھئے کہ جدید ذہن کیا ہے۔ جدید ذہن دراصل سائنسی ذہن کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی ذہن کا مطلب حقائق کو اہمیت دینے والا ذہن ہے۔ سائنس کے انقلاب نے موجودہ زمانہ میں انسانی فکر میں جو تبدیلی کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بات کہی جائے تجربہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر کہی جائے نہ کہ مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر۔ موجودہ زمانہ میں جو انقلاب آیا ہے وہ حقائق فطرت کے مطالعہ سے آیا ہے۔ بائیسکل سے لے کر ہوائی جہاز تک اور بجلی کے لیمپ سے لے کر بڑے بڑے صنعتی کارخانوں تک ہر چیز فطری حقائق کی بنیاد پر چل رہی ہے۔ یہی انقلاب موجودہ زمانہ کا غالب انقلاب ہے۔ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر ڈالا ہے۔ اسی نے موجودہ زمانہ میں اسلوب کلام کو بھی بدل دیا ہے۔ انسان ہزاروں سال سے پر اسرار عملیات کی بنیاد پر لوہے کو سونا بنانے کی کوشش کرتا رہا مگر وہ کامیاب نہیں ہوا۔ اب حقائق فطرت کو دریافت کر کے وہ لوہے کو مشینوں میں تبدیل کر رہا ہے جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ ایسی حالت میں بالکل قدرتی بات ہے کہ آج کا انسان حقائق فطرت کی بنیاد پر ثابت ہونے والی بات کو سب سے زیادہ باوزن سمجھے۔ آج کے انسان نے جو ترقیاں کی ہیں وہ حقائق کی بنیاد پر کی ہیں اس لئے آج کا انسان انھیں باتوں کو اہمیت دیتا ہے جو حقائق کے زور پر ثابت ہوتا ہو۔

قدیم اور جدید ذہن کے فرق کو ایک سادہ مثال سے سمجھئے۔ پچاس سال پہلے اطبار کے یہاں اس قسم کے الفاظ بے حد پرکشش سمجھے جاتے تھے ——— خاندانی نسخہ، پشتینی علاج، شاہی ترکیب سے بنی ہوئی دوا۔ کسی دوا یا منجن کے بارے میں یہ الفاظ بولنے کا مطلب یہ تھا کہ اس میں پر اسرار خواص چھپے ہوئے ہیں۔ مگر آج ان الفاظ کے اندر کوئی قیمت نہیں۔ آج کا ڈاکٹر کسی دوا یا کسی ٹوتھ پیسٹ کی اہمیت کو بتانے کے لئے "قدیمی نسخہ" کی اصطلاح نہیں بولے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ سائنسی طریقوں سے بنایا گیا ہے۔ سائنسی طریقہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کی افادیت کو معلوم تجربات و مشاہدات کے ذریعہ جانا جا چکا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کوئی چاہے تو ان تجربات کو دہرا کر دوبارہ ان کے نتائج کی صحت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ جب کہ خاندانی علاج کا مطلب یہ تھا کہ اس کے طبی خواص ہر ایک کے لئے قابل دریافت نہیں ہیں۔ دوا اور مرض کے درمیان تعلق کو متعین تجربات کے ذریعہ معلوم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی اہمیت بس یہ ہے کہ وہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ آج کا انسان اسی منجن کو استعمال کرنا پسند کرتا ہے جو سائنسی، بالفاظ دیگر، فطری حقیقتوں کی پیروی کرتے ہوئے بنا ہو۔ اسی طرح وہ صرف ان افکار کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوتا ہے جن کا برحق ہونا فطری حقائق کے ذریعہ معلوم ہوا ہو۔

سائنسی انقلاب سے پہلے انسانی فکر کی بنیاد فلسفیانہ قیاسات پر قائم تھی، سائنسی انقلاب کے بعد انسانی فکر کی بنیاد معلوم حقائق و واقعات پر رکھی گئی ہے۔ اسی سے قدیم علم کلام اور جدید علم کلام کا فرق سمجھا جا سکتا ہے۔ قدیم علم کلام کی بنیاد فلسفیانہ طرز استدلال پر تھی، جدید علم کلام کی بنیاد فطری طرز استدلال پر ہے۔ پہلے قیاسی منطق کے ذریعہ بات کو ثابت کیا جاتا تھا۔ اب وہ زمانہ ہے کہ بات کو حقیقی شواہد کے ذریعہ ثابت کیا جائے۔

جدید ذہن کی اس مختصر وضاحت کے بعد اب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جدید طرز استدلال دوسروں کے لئے خواہ جدید ہو مگر اسلام کے لئے وہ جدید نہیں۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ قرآن کا طرز استدلال عین وہی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں حقائق فطری سے استدلال کہا جاتا ہے تو یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ جدید علم کلام دراصل قرآنی علم کلام ہے۔ جدید معقولات اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ قرآنی معقولات کی طرف لوٹنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ چار ہزار سال پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قدیم عراق کی مشرک قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی تو سورج، چاند اور ستاروں کے مشاہدات سے اپنی دعوت کے اوپر دلیل قائم کی۔ آنجناب کا یہ واقعہ سورہ انعام (رکوع ۹) میں بیان ہوا ہے۔ وہاں قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں: وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علیٰ قومہ (یہ ہماری دلیل ہے جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے اوپر عطا کی) یہاں حجتنا کا لفظ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو انداز کلام اختیار کیا وہ خدائی انداز کلام تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجت خداوندی یا استدلال الٰہی کا طریقہ یہ ہے کہ کائنات کے معلوم و مشہود حقائق سے استدلال کیا جائے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ خدا نے اپنی کتاب میں جو تعلیم قلمی طور پر دی ہے، ساری کائنات کو اس کے حق میں عملی دلیل بنا دیا ہے۔ پھر جو دلیل خود خدا نے مقرر کی ہو اس سے بڑھ کر دلیل اور کون سی ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف قرآن میں کہا گیا ہے کہ ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق (جاثیہ ۲۹) اور دوسری طرف کائنات کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ماخلقنا ھما الا بالحق (دخان ۳۹) قرآن اور کائنات دونوں ایک ہی مشیت ربانی کا اظہار ہیں، ایک جگہ یہ اظہار لفظی صورت میں ہو رہا ہے اور دوسری جگہ عملی صورت میں۔

قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام انتہائی قدیم زمانہ کے پیغمبر ہیں۔ مگر آنجناب کا طرز استدلال بھی ٹھیک وہی تھا جس کو آج ہم فطری یا حقیقی شواہد پر مبنی استدلال کہتے ہیں۔ سورۂ نوح کو دیکھئے۔ حضرت نوح کی زبان سے ارشاد ہوا ہے: فقلت استغفروا ربکم انہ کان غفارا۔ یرسل السماء علیکم مدرارا۔ ویمددکم باموال وبنین۔ ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انھارا۔ مالکم لاترجون للہ وقارا۔ وقد خلقکم اطوارا۔ الم تروا کیف خلق اللہ سبع سماوات طباقا۔ وجعل القمر فیھن نورا وجعل الشمس سراجا۔ واللہ انبتکم من الارض نباتا۔ ثم یعیدکم فیھا

ویخرجکم اخراجا۔ واللہ جعل لکم الارض بساطاً لتسلکوا منہا سبلاً فجاجا (نوح) اس کے بعد آپ قرآن کے دعوتی اسلوب کو دیکھئے تو اس میں بھی آپ کو ہر جگہ یہی طریقہ ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سارا قرآن اسی اندازِ دعوت سے بھرا ہوا ہے جس کو ہم نے فطری انداز کہا ہے۔ مثلاً افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ و الی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت والی الارض کیف سطحت (غاشیہ)

یہی اصل اسلامی استدلال ہے۔ یہی خدا کے تمام پیغمبروں نے اختیار کیا اور اسی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ مگر دوسری صدی ہجری میں عباسی خلافت کے زمانہ میں جب علوم اسلامی کی تدوین ہوئی تو بعض اتفاقی اسباب کے نتیجہ میں اسلامی علم کلام کو قدیم منطق و فلسفہ کی بنیاد پر مرتب کر دیا گیا۔ امام غزالی کے زمانہ میں یہی علم کلام اسلامی مدارس کے نصاب میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد نسل در نسل یہ سلسلہ چلتا رہا۔ حتی کہ علم کلام ایک منطقی علم کے ہم معنی قرار پا گیا۔ مگر یہ قرآن سے سراسر انحراف تھا۔ یہ علم کلام اسلامی استدلال کی بنیاد قیاسی منطق پر رکھ رہا تھا جب کہ قرآن نے اسلامی استدلال کی بنیاد فطرت کے شواہد پر رکھی تھی۔ منطقی کلامیات کا لوگوں کے اوپر اتنا غلبہ ہوا کہ ایک ہزار سال تک بھی وہ اس سے باہر نہ آسکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں خود خارجی حالات ہم کو مجبور کر رہے ہیں کہ ہم اس کو چھوڑیں اور دوبارہ قرآن کے فطری اسلوب کی طرف واپس جائیں۔ سائنسی انقلاب سے پہلے یہ علم کلام کم از کم علمی حیثیت سے کچھ قدر و قیمت رکھتا تھا۔ مگر آج وہ علمی قدر و قیمت بھی کھو چکا ہے اور دعوتی افادیت جو پہلے بھی اس کے اندر موجود نہ تھی وہ اب اور زیادہ اس سے دور جا چکی ہے۔

جدید علم کلام، بالفاظ دیگر، قرآنی علم کلام کیا ہے۔ اس کو قرآنی آیات کے تتبع سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ میں یہاں مختصر طور پر قرآنی کلامیات یا قرآنی معقولات کے چند پہلوؤں کو بیان کروں گا۔ یہ پہلو قرآنی علم کلام کو جاننے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۔ قرآنی کلامیات کے پہلے اصول کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے:

یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا (اسراء ۸۵)	لوگ تم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہو کہ روح خدا کے حکم سے ہے۔ اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہاں سوال کرنے والے نے ایک سوال کیا تھا اور وہ سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ مگر اس کو کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ سوال کا جواب دینے کے بجائے خود سوال کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن کا حقیقی جواب آدمی کے حدودِ فہم سے باہر ہوتا ہے۔ وہ ایسے جوابات کو اسی طرح نہیں سمجھ سکتا جس طرح ماں کے پیٹ کے اندر کا بچہ باہر کی دنیا کو نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے جب کوئی شخص ایسے سوالات میں الجھے تو اس کی بہترین مدد یہ ہے کہ اس کو ایسے سوالات میں الجھنے سے روکا جائے۔ اس کے برعکس اگر جواب دینے والا

اس کا جواب دینے بیٹھ جائے تو وہ خود بھی بے راہ ہو گا اور سائل کو بھی بے راہ کرے گا۔

میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک سوال میں بہت عرصہ سے الجھا ہوا ہوں، آپ اس کو حل کیجئے۔ پھر انھوں نے کہا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہی آدمی کے عمل کے مطابق اس کا عذاب و ثواب شروع ہو جاتا ہے۔ اب کوئی شخص ہے جو آج ساٹھ سال گزار کر مرجاتا ہے، کوئی شخص ہے جو دس ہزار سال پہلے اتنی ہی عمر گزار کر مرچکا ہے۔ یہ دونوں اگر جہنمی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں برے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ سزا پائی اور دونوں اگر جنتی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یکساں اچھے عمل پر ایک شخص نے دوسرے کے مقابلہ میں دس ہزار سال زیادہ جنت کا لطف حاصل کیا۔ ایسی حالت میں تو خدا کو چاہئے تھا کہ وہ سب کو ایک وقت میں پیدا کرتا اور سب کو ایک وقت میں مارتا۔ تاکہ ہر ایک کو برابر جزا یا سزا ملے۔

اس قسم کے سوالات صرف ذہنی بے راہی کے سوالات ہیں۔ ہم ایک محدود دنیا میں رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن زمان و مکان کی حدبندیوں میں رہ کر سوچتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم اس دنیا کی حقیقتوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں نہیں لا سکتے جو لامحدود ہے اور زمان و مکان کی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ ایسی دنیا کے بارے میں ہم صرف اجمالی علم حاصل کر سکتے ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں صرف اجمالی علم پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی خواہش کرنا صرف اپنے کو بے راہی کے خطرہ میں ڈالنا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آیتیں اتاری ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک محکمات، دوسری متشابہات۔ محکم آیتیں وہ ہیں جو ہماری معلوم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسے امور میں خدا نے براہ راست زبان میں اپنا حکم ارشاد فرمایا ہے۔ ان احکام کو ہم لفظی طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ جیسے یہ حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹو (مائدہ ۳۸)۔ متشابہ آیتوں سے مراد متماثل آیتیں ہیں۔ یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق غیب کی دنیا سے ہے۔ ایسی آیتوں میں اللہ نے بات کو تمثیلی زبان (Symbolic Language) میں بیان کیا ہے جیسے یہ کہ اللہ تخت پر متمکن ہوا (اعراف ۵۴) محکم آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کرنا مفید ہے۔ لیکن اگر اسی طرح متشابہ آیتوں میں تفصیلات اور تعینات تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔

علم کی یہ تقسیم فطرت کے عین مطابق ہے۔ جدید سائنس نے عالم فطرت کی جو تحقیق کی ہے اس نے انسانی علم کی محدودیت کو آخری طور پر ثابت کر دیا ہے۔ جدید دنیا کا یہ مسلّمہ ہے کہ انسان اپنی محدودیتوں کی وجہ سے اشیاء کا صرف جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، وہ کلی علم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس اعتبار سے قرآنی کلامیات کا پہلا اصول عین علمی اصول ہے۔ یہ وہ اصول ہے جس پر جدید ذہن خود اپنی تحقیق کے نتیجہ میں پہنچ چکا ہے۔

۲۔ قرآنی کلامیات کا دوسرا اصول حقائق فطرت سے استدلال ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم

ان کو آفاق کی اور انفس کی نشانیاں دکھائیں گے تاکہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ قرآن کی دعوت سراسر حق ہے۔ (حم سجدہ ۵۳) اس سلسلے میں یہاں چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں :

الف ۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، اس کو مانو۔ اس دعوت کے حق میں دلیل کیا ہے۔ قدیم متکلمین نے اپنے فلسفیانہ ذوق کے تحت اس پر قیاسی دلیلیں قائم کیں۔ مگر قرآن اس کے حق میں مشاہداتی دلیل دیتا ہے۔ قرآن کا کہنا ہے کہ جو کائنات تمھاری آنکھوں کے سامنے ہے اور جس کا تم انکار نہیں کر سکتے، وہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے :

اَوَلَمْ یَرَ الَّذِینَ کفروا اَنَّ السماواتِ والارضَ کانَتَا رَتْقاً ففتقنا ھما وجعلنا من الماء کل شیئٍ حیٍّ افلا یؤمنون (انبیاء ۳۰)	کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا اور ہم نے پانی سے ہر جاندار کو بنایا، پھر کیا وہ ایمان نہیں لاتے

ان آیات میں واضح طور پر اس کائناتی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کو موجودہ زمانہ میں بگ بینگ نظریہ کہا جاتا ہے۔ خدا کی نگاہ میں اول سے آخر تک تمام انسان ہیں۔ وہ غیر زمانی انداز میں خطاب کرتے ہوئے تمام منکروں سے کہہ رہا ہے کہ ایک خدا کی دلیل خود اس کائنات میں موجود ہے جس کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔ پھر تم اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہو۔

۱۹۱۲ میں امریکی عالم فلکیات وسٹو ملوین سلیفر (Vesto Melvin Slipher) نے لوویل آبزرویٹری میں تحقیق کرتے ہوئے پایا کہ کچھ کہکشائیں تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ اس کے بعد ایڈوین ہبل (Edwin Hubble) اور ملٹن ہیومیسن (Milton Humason) نے ماؤنٹ ولسن کی سو انچ کی دوربین پر مشاہدہ کر کے بتایا کہ تمام کی تمام کہکشائیں اپنے بیرونی سمت میں تیزی سے چلی جا رہی ہیں۔ پھر ڈچ عالم فلکیات ولیم ڈی سٹر (Willem de Sitter) نے اس نظریہ کے حق میں مزید تائیدی شواہد جمع کیے۔ ۱۹۶۵ میں نیوجرسی کے آرنو پنزیاز (Arno Penzias) اور ولسن (Robert Wilson) نے ابتدائی کائناتی دھماکہ کے دوران نکلی ہوئی بعض شعاعیں (Radiation) دریافت کیں۔ اس قسم کی مختلف دریافتوں کے بعد اب یہ نظریہ ایک ثابت شدہ حقیقت سمجھا جانے لگا ہے۔

اس نظریہ کا مطلب یہ ہے کہ کائنات ہمیشہ سے نہیں ہے بلکہ وہ واضح طور پر اپنا ایک متعین آغاز رکھتی ہے۔ وہ ایک وقت خاص میں شروع ہوئی۔ یہ نظریہ بتاتا ہے کہ ہم ایک پھیلتی ہوئی کائنات میں ہیں۔ ہمارے چاروں طرف کہکشائیں بے حد تیزی سے بیرونی سمت میں بھاگ رہی ہیں۔ حساب سے معلوم ہوا ہے کہ اس بیرونی رفتار کو اگر اندر کی طرف لوٹایا جائے تو تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال میں تمام پھیلی ہوئی کائنات سمٹ کر ایک گولا بن جائے گی۔ اس نظریہ نے

خدا کے وجود کو فطرت کے قانون کے ذریعہ ثابت کر دیا ہے کیونکہ ایک جمے ہوئے مادی گولے کے اندر ایک وقت خاص میں بیرونی سمت کی طرف مسلسل حرکت کسی خارجی محرک کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ پر ایک امریکی سائنس داں رابرٹ جیسٹرو (Robert Jastrow) کا مضمون شائع کرتے ہوئے ریڈرز ڈائجسٹ (اکتوبر ۱۹۸۰) نے اس کا عنوان ان الفاظ میں قائم کیا ہے: کیا فلکیاتی علما رخدا کو پا گئے ہیں:

Have Astronomers Found God

وہ سائنس داں جنھوں نے یہ عقیدہ بنالیا تھا کہ کائنات کے ہر واقعہ کی اس طرح عقلی توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ماضی کے کسی طبیعی واقعہ کا نتیجہ نظر آئے۔ ایسے لوگ اس دریافت سے بے حد گھبرا اٹھے۔ کیونکہ اس سے کائنات میں طبیعی عمل اور ردعمل کے بجائے ایک زندہ خدا کی ارادی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ حقائق کا انکار ان کے لئے ممکن نہ تھا، انھوں نے اس واقعہ کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے اس کا نام بگ بینگ (بڑا دھماکہ) رکھ دیا۔ گویا کہ کائنات کا آغاز بس ایک بڑا پٹاخہ چھوٹنے کا معاملہ تھا اور بس۔ اسی قسم کے ایک امریکی عالم نے ایک مذہبی شخص سے مذاق کے انداز میں پوچھا کہ خدا نے جب زمین و آسمان نہیں بنائے تھے اس وقت وہ کیا کر رہا تھا۔ مذہبی شخص نے بگڑ کر جواب دیا کہ وہ ان لوگوں کے لئے جہنم تیار کرنے میں مشغول تھا جو اس قسم کے سوالات کرتے ہیں:

He was creating hell for people who asked questions like that

ب۔ قرآن کہتا ہے کہ موجودہ دنیا آخری دنیا نہیں۔ اس کے بعد ایک اور دنیا ہے۔ یہ دنیا اگرچہ آج ہم کو اپنی آنکھ سے دکھائی نہیں دیتی مگر وہ ایک مکمل حقیقت کے طور پر موجود ہے۔ قرآن کے اس دعوے کے حق میں بھی قدیم متکلمین نے فلسفیانہ قیاسات کے ذریعہ دلائل قائم کر لئے تھے۔ مگر قرآن نے اس کے حق میں ایسی دلیل پیش کی جس کو انسان اپنے تجرباتی علم کے ذریعہ جان سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

ومن کل شیئٍ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون (ذاریات ۴۹) اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم دھیان کرو

یعنی جب ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مل کر اپنی تکمیل کرتی ہے تو اس کائناتی قانون کے مطابق موجودہ دنیا کا بھی ایک جوڑا ہونا چاہئے جو اس کی تکمیل کرے۔ دنیا کے اسی جوڑے کا نام آخرت ہے۔

آدمی میں اور جانوروں میں جوڑے کا ہونا انسان کو قدیم ترین زمانہ سے معلوم تھا۔ پھر درختوں کے اندر جوڑے ہونے کا علم ہوا۔ تاہم ۱۹۲۸ تک یہ معلوم نہ تھا کہ جامد مادہ کا بھی جوڑا ہوتا ہے۔ اسی سال ریاضیاتی طبیعیات کے ایک عالم پال ڈیراک (Paul A.M. Dirac) نے مادی ذرہ کے ساتھ ایک نئے قسم کے غیر مرئی ذرہ کی موجودگی کا امکان ظاہر کیا۔ ۱۹۳۲ میں اینڈرسن (K. Anderson) نے کاسمک شعاعوں کے مطالعہ کے دوران معلوم کیا کہ الیکٹران کے ساتھ ایک اور ذرہ ہے جو اس کے مخالف برقی چارج رکھتا ہے۔ اس نئے ذرہ کا نام اینٹی

الکٹران رکھا گیا۔ یہ تحقیق آگے بڑھتی رہی۔ بالآخر معلوم ہوا کہ کائنات کے تمام ذرات جوڑوں (Pair Particles) کی شکل میں ہیں۔ پارٹکل کا اینٹی پارٹکل، ایٹم کا اینٹی ایٹم، میٹر کا اینٹی میٹر، حتیٰ کہ ورلڈ کا اینٹی ورلڈ جیسا کہ ڈیراک نے ۱۹۳۳ میں بتایا۔

موجودہ زمانہ میں بہت سے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اینٹی ورلڈ ہم سے الگ اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ موجودہ دنیا میٹر کی ترکیب سے بنی ہے، اب کائناتی قانون کے مطابق ایک اور دنیا اینٹی میٹر سے ترکیب یافتہ موجود ہونا چاہئے۔ قیاس ہے کہ ۲۰ ہزار ملین سال پہلے جب بگ بینگ کا واقعہ ہوا تو اسی وقت فوٹان میٹر اور اینٹی میٹر کی دو مختلف صورتوں میں مجتمع ہو گئے اور ورلڈ اور اینٹی ورلڈ کو بنانے میں لگ گئے۔

اس نظریہ پر پہلے سویڈش طبیعیات داں اوسکر کلین (Osker Klein) اور طبیعی فلکیات داں ہینز الفوین (Hannes Alfven) نے کام کیا تھا اور ۱۹۶۳ میں اپنے نتائج تحقیق پیش کئے۔ اس کے بعد سودیت ریاضی داں ڈاکٹر گستاف نان (Gustav Naan) نے اس کو مزید مستحکم کیا۔ ڈاکٹر گستاف نان کا کہنا ہے کہ اینٹی ورلڈ کو طبیعیات کے معلوم نظریات وقوانین کے ذریعہ پوری طرح بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا یقین ہے کہ اینٹی ورلڈ آج بھی موجود ہے مگر وہ ہم سے آزاد اور ہماری دنیا کے متوازی اپنا وجود رکھتا ہے۔ ہماری موجودہ دنیا میں تمام اینٹی پارٹیکل غیر قائم (Unstable) حالت میں ہیں۔ مگر اینٹی ورلڈ میں وہ سب قائم (Stable) حالت میں ہوں گے۔ کیونکہ تمام ایٹموں کے نیوکلیس منفی برقی چارج رکھتے ہوں گے اور تمام الکٹران مثبت برقی چارج۔

ج۔ اس سلسلہ میں ایک اور مثال لیجئے۔ قرآن میں فرعون کے بارے میں ارشاد ہوا ہے:

فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة وان كثیرا من الناس عن آیاتنا لغافلون	پس آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تو پیچھے آنے والوں کے لئے ایک نشان رہے۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔
یونس ۹۲	

اس آیت کے مطابق خدا نے فرعون کی لاش کو بعد کی نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ ۱۸۹۸ کی بات ہے کہ مغرب کے ماہرین اثریات نے فرعون کی لاش کو قدیم مصری شہر تھیبس (Thebes) سے کھدائی کرکے نکالا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کا سابقہ مصر کے دو فرعونوں سے ہوا تھا۔ آپ ریمسس دوم کے زمانہ میں پیدا ہوئے۔ مگر غرقابی کا واقعہ اس کے بعد اس کے بیٹے مرنفتاح (Merneptah) کے ساتھ پیش آیا۔ جس کا زمانہ تیرھویں صدی قبل مسیح ہے۔ دونوں فرعونوں کی ممی کی ہوئی لاش اب قاہرہ کے عجائب خانہ میں عام زیارت کے لئے موجود ہے۔ سائنسی جانچ سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مرنفتاح وہی فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانی میں غرق ہو کر مرا تھا۔

بائبل کا بیان ہے کہ فرعون ڈوب کر ختم ہوگیا۔ وہ اس کی لاش کی موجودگی کا کوئی اشارہ نہیں کرتی۔ تاریخ اس بارے میں مکمل طور پر خاموش ہے۔ قرآن کے نزول کے وقت اور اس کے بعد ایک ہزار سال سے زیادہ مدت تک انسان کو فرعون کی لاش کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ مگر قرآن کے کلام اللہ ہونے کی یہ کیسی عجیب شہادت ہے کہ موجودہ زمانہ میں حیرت انگیز طور پر اس کی لاش محفوظ حالت میں دریافت ہوگئی۔ ڈاکٹر موریس نے دس صفحات میں اس کی تفصیل دیتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

> Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Quran dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo
>
> The Bible, The Quran and Science, 1976, P. 241

یعنی جو لوگ مقدس کتابوں کی سچائی کے لئے جدید ثبوت مانگتے ہیں وہ قرآن کی ان آیات کو پڑھیں اور اس کے بعد قاہرہ کے میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں تو وہ اس کی نہایت شان دار تصدیق پالیں گے۔

اس موضوع پر جو لوگ زیادہ تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں وہ ڈاکٹر موریس (Dr. Maurice Bucaille) کی کتاب دی بائبل دی قرآن اینڈ سائنس کا مطالعہ کریں۔ یہ اس موضوع پر ایک قابل قدر کتاب ہے۔ مصنف کو شوق تھا کہ وہ قرآن کے سائنسی بیانات کا جدید تحقیقات سے مقابلہ کریں۔ اس کے لئے انھوں نے برسوں تحقیق کی۔ صرف اسی مقصد سے عربی زبان سیکھی تاکہ قرآن کو براہ راست اس کی زبان میں سمجھ سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے ڈھائی سو صفحات پر مشتمل مذکورہ کتاب شائع کی۔

ڈاکٹر موریس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے سائنسی حقائق کا مقابلہ قرآن کے بیانات سے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک قدیم کتاب کی جدید تحقیقات سے اس درجہ مطابقت اس کے بغیر نہیں ہوسکتی کہ وہ بشری ذہن سے ماورا کسی ذہن سے نکلی ہو۔ وہ اپنی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں:

> In view of the level of knowledge in Mohammad's day, it is inconceivable that many of the statements in the Quran which are connected with science could have been the work of a man. It is, moreover, perfectly legitimate, not only to regard the Quran as the expression of a Revelation, but also to award it a very special place, on account of the guarantee of authenticity it provides and the presence in it of scientific statements which, when studied today, appear as a challenge to explanation in human terms.

محمدؐ کے زمانہ میں علم کی جو سطح تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ قرآن کے بہت سے بیانات جو سائنس سے تعلق رکھتے ہیں وہ کسی آدمی کے لکھے ہوئے ہوں۔ یہ بات پوری طرح معقول ہے کہ قرآن کو نہ صرف خدائی الہام کا ظہور سمجھا جائے بلکہ مزید اس کو ایک بہت امتیازی درجہ دیا جائے۔ قرآن اپنے مستند ہونے کی جو ضمانت

دیتا ہے اور اس کے اندر جو سائنسی بیانات ہیں، جب ان کا مطالعہ آج کیا جاتا ہے تو وہ قرآن کو انسانی کتاب قرار دینے کے خلاف ایک چیلنج معلوم ہوتے ہیں۔

۳۔ قرآنی کلامیات کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کائنات کے اس پہلو کو نمایاں کیا جائے کہ خدا نے اس کو ہمارے لئے بطور میزان مقرر کیا ہے۔ قرآن کی دعوت یہ ہے کہ انسان خدا کی اطاعت کرے، وہ اپنے عجز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے خالق و مالک کے آگے ڈال دے۔ اس مطالبہ کے حق میں قرآن نے فلسفیانہ قسم کے دلائل نہیں قائم کئے بلکہ فطری انداز کے دلائل قائم کئے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک آیت کا مطالعہ کیجئے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیه بأس شدید ومنافع للناس ولیعلم الله من ینصره ورسله بالغیب ان الله قوی عزیز (حدید ۲۵)

ہم نے اپنے پیغمبروں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ قائم رہیں انصاف پر۔ اور ہم نے لوہا اتارا اس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدہ ہے۔ اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون بے دیکھے اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

میزان عربی زبان میں ترازو کو کہتے ہیں۔ یعنی وہ آلہ جس سے تول کر کسی چیز کی برابری کسی دوسری چیز سے معلوم کی جائے۔ پوری کائنات اس معنی میں خدا کی میزان ہے۔ کائنات کی ہر چیز کو خدا نے اسی حق و عدل کی بنیاد پر قائم کر رکھا ہے جس کا مطالبہ انسان سے کیا جا رہا ہے۔ کائنات کی تمام چیزیں جس عدل پر بجبر قائم ہیں اسی عدل پر انسان کو اپنے آزاد ارادہ سے قائم ہونا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کتاب میں اپنی پسند کے تمام عادلانہ طریقے بتا دئے ہیں۔ دوسری طرف کائنات کو عملاً انھیں عادلانہ طریقوں پر قائم کر دیا ہے۔ اب انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ قرآن میں اصول عدل کو پڑھ کر اس سے رہنمائی حاصل کرے۔ اور اسی کے ساتھ کائنات کے ربانی پیمانہ سے ناپ کر دیکھتا رہے کہ اس کا طریقہ خدا کے پسندیدہ معیار کے مطابق ہے یا نہیں۔ اس سلسلے میں یہاں میزان کے طور پر لوہے کا ذکر کیا گیا ہے۔ لوہے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے مومن کے بے خطا کردار کو ممثل کیا ہے۔ موجودہ زندگی میں ہر قسم کا نفع قابل اعتماد کردار سے وابستہ ہے۔ مادہ کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار لوہے کا ہوتا ہے۔ انسان کی دنیا میں یہی طاقت ور کردار خدا کو اپنے بندوں سے مطلوب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک مثال شہد کی مکھی کی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کو حکم دیا کہ پہاڑوں اور درختوں میں اور ٹٹیوں پر چڑھائی ہوئی بیلوں میں اپنے گھر بنا۔ پھر ہر طرح کے پھلوں کا رس چوس۔ اور اپنے رب کی ہموار کی ہوئی راہوں میں چل۔ اس مکھی کے اندر سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہیں۔

اس میں لوگوں کے لئے شفاہے۔ اس واقعہ میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو دھیان دیتے ہیں (نحل)

شہد کی مکھی کا نظام ایک انتہائی جامع اور کامل قسم کا سماجی نظام ہے۔ اس میں وہ تمام اجزا پائے جاتے ہیں جو انسان کے بنائے ہوئے سماجی اور تمدنی نظام میں ہوتے ہیں۔ مگر شہد کی مکھیوں کا نظام ان تمام خرابیوں سے یکسر خالی ہوتا ہے جس کا شکار انسان کے سماجی اور تمدنی نظام ہمیشہ ہوا کرتے ہیں۔ شہد کی مکھی اپنی بستی بسانے کے لئے ایک جگہ کا انتخاب کرتی ہے۔ وہاں وہ ایک مکمل شہر بساتی ہے۔ وہ ایک انتہائی پیچیدہ قسم کا کارخانہ قائم کرتی ہے۔ وہ اپنے کارخانہ میں سیکڑوں میل سے ضروری سامان حاصل کرکے لاتی ہے۔ ہزاروں مکھیاں بیک وقت اپنے اپنے مقررہ کام میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ ان کی اس تنظیم اور اس جدوجہد کا آخری نتیجہ ایک قیمتی پیداوار (شہد) کی صورت میں برآمد ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی تیار غذا ہے اور اسی کے ساتھ انسانی امراض میں بہترین علاج بھی۔

شہد کی مکھیاں اتنا بڑا نظام چلاتی ہیں مگر وہ اپنی آبادکاری کے لئے کسی دوسرے کا گھر نہیں اجاڑتیں۔ وہ پھولوں کا رس لینے کے لئے پھولوں کو نہیں مسلتیں۔ ان کی اجتماعی جدوجہد میں کبھی باہمی ٹکراؤ کا واقعہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی محنت سے حاصل کی ہوئی پیداوار کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرتیں اور نہ اس کو اپنی چیز سمجھ کر سب کا سب اپنے اوپر خرچ کر ڈالتی ہیں۔ وہ اس کا بڑا حصہ دوسروں کی ضرورت کے لئے وقف کر دیتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کی دنیا میں ہر کام ٹھیک اسی طرح انجام دیا جاتا ہے جس طرح اسے انجام دیا جانا چاہئے۔ شہد کی مکھی خدا کے حکم سے اس بات کا عملی مظاہرہ کر رہی ہے کہ انسان کو اپنی سماجی زندگی کا نظام کس طرح بنانا چاہئے۔

اسی طرح تمام خدائی احکام کی تمثیل کائنات میں قائم کر دی گئی ہے (سجدہ کی تمثیل درخت کے سایہ کی صورت میں، قابل اعتماد کردار کی تمثیل لوہے کی صورت میں، تصادم کے بغیر سفر حیات کی تمثیل ستاروں کی اپنے اپنے مدار پر گردش کرنے کی صورت میں، اتحاد کار کی تمثیل شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی صورت میں، اپنے اور غیر کو یکساں فیض پہنچانے کی تمثیل سورج کی روشنی کی صورت میں، وغیرہ) توحید اور اطاعت الٰہی کی طرف بلانے کے لئے قرآن کا یہ انداز عین فطری ہے۔ وہ ٹھیک اسی کائناتی استدلال پر قائم ہے جس پر جدید انسان نے اپنے علم و عمل کی پوری بنیاد کھڑی کی ہے۔ اگر ہم اس کو مؤثر طور پر آج کے انسان کے سامنے رکھ سکیں تو یقیناً ان میں سے بہت سے لوگ اسلام کو اپنے دل کی آواز پائیں گے۔ انسان چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے اپنا مہینہ اور سال شمار کرتا ہے۔ وہ زمین اور سورج کی حرکت سے اپنی گھڑیوں کا وقت مقرر کرتا ہے۔ وہ اپنی مشینوں کو قدرت کے نمونوں پر بناتا ہے (کشتی کو مچھلی کے نمونہ پر، ہوائی جہاز کو چڑیا کے نمونہ پر، کیمرہ کو آنکھ کے نمونہ پر، وغیرہ) اسی طرح وہ کائناتی اخلاقیات کو بھی اپنے اخلاق کے لئے معیار قرار دے سکتا ہے، بشرطیکہ ہم اس کو صحیح طور پر اس کے سامنے پیش کر دیں۔ اگر وہ کائنات سے اپنا مادی معیار لے رہا ہے تو اسی کائنات سے وہ اپنا اخلاقی معیار کیوں نہیں لے سکتا۔

۴۔ جدید علم کلام کا چوتھا اصول بات کو سادہ انداز میں کہنا ہے۔ سادہ انداز سے مراد حقیقت پسندی کا انداز ہے جس میں بات کو اس کے فطری ڈھنگ سے بیان کیا گیا ہو نہ کہ ادب کے تقاضوں کی بنا پر کسی قسم کے مصنوعی انداز میں۔ سادہ اسلوب میں معنی اور قاری کے درمیان کوئی تیسری چیز رکاوٹ نہیں بنتی۔ جب کہ غیر سادہ اسلوب میں الفاظ دونوں کے درمیان غیر ضروری طور پر حائل ہو جاتے ہیں۔

انسان کو خدا نے سادہ فطرت پر پیدا کیا ہے۔ اس لئے جب بات کو سادہ انداز میں کہا جائے تو گویا گول خانہ میں گول چیز رکھی گئی۔ اس کے برعکس جب بات کو کسی قسم کے بناوٹی انداز میں کہا جائے تو یہ گول خانہ میں چوکھنٹی چیز رکھنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ انداز میں کہی ہوئی بات انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہے۔ وہ اس کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اس کی پوری ہستی میں سما جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب بات کو مصنوعی اور پیچدار انداز میں بیان کیا جاتا ہے تو وہ انسان کی ہستی میں نہیں سماتی، وہ اس کے اندرون کا جزر نہیں بنتی۔ وہ ادھر اُدھر اٹک کر رہ جاتی ہے۔

قدیم زمانہ میں ادبی اسلوب ساری دنیا میں رائج تھا۔ کوئی اپنی بات کو شاعری کے اسلوب میں بیان کرتا تھا اور کوئی سجع کے اسلوب میں۔ کوئی تمثیل کے اسلوب میں اپنی بات پیش کرتا تھا اور کوئی کہانی کے اسلوب میں۔ موجودہ زمانہ میں ان اسالیب کی اہمیت بہت گھٹ گئی ہے۔ اب برتر اسلوب وہ سمجھا جاتا ہے جس میں بات کو واقعہ نگاری اور حقیقت بیانی کے انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسلوب جدید سائنسی انقلاب کی دین ہے۔ اسی لئے اس کو سائنسی اسلوب کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس اسلوب کا آغاز انسانی تاریخ میں پہلی بار قرآن نے کیا تھا۔

قرآن تاریخ کی پہلی معلوم کتاب ہے جس نے مصنوعی اسلوب کو چھوڑ کر فطری اسلوب میں بات کہنے کی بنیاد ڈالی۔ سائنسی اسلوب دراصل قرآنی اسلوب ہی کی ایک جدید شکل ہے۔ تاہم قرآن کے نزول کے سو برس بعد مسلمانوں کے درمیان قدیم منطق و فلسفہ کا رواج شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ تقریباً تمام اسلامی علوم میں دوبارہ وہی مصنوعی انداز غالب آگیا جس کو قرآن نے ختم کیا تھا۔ لوگ اس کو کمال سمجھنے لگے کہ دین کی سادہ تعلیمات کو فنی موشگافیوں اور منطقی اصطلاحوں میں ڈھالیں اور اس کو منثور نظم یا منظوم نثر میں سجا کر پیش کریں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم دوبارہ قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں۔ آج کے انسان کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش کرنے کے لئے سائنسی اسلوب لازمی طور پر ضروری ہے۔ تاہم یہ سائنسی اسلوب خود قرآنی اسلوب ہی کا دوسرا نام ہے۔ سائنسی اسلوب کو اختیار کر کے ہم سادہ طور پر صرف قرآنی اسلوب کی طرف لوٹیں گے نہ کہ کوئی نئی چیز اختیار کریں گے۔

احیاء اسلام

تمہید

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کا دین سر بلند ہو۔ اس کو دنیا میں غالب فکر کا مقام حاصل ہو۔ مگر دین کے فکری غلبہ کے لئے عالمی حالات کی موافقت ضروری ہے۔ خدا نے ہزاروں سال کے عمل سے پیغمبر آخر الزماں کے لئے موافق حالات پیدا کئے۔ آپ نے ان حالات کو جانا اور ان کو حکیمانہ طور پر استعمال کر کے اسلام کو دنیا میں غالب فکر کا مقام عطا کیا۔

اب دوبارہ پچھلے ہزار سال کے عمل کے نتیجہ میں خدا نے وہ تمام موافق حالات جمع کر دئے ہیں جن کو استعمال کر کے از سر نو اسلام کو دنیا کا غالب فکر بنایا جا سکے۔ اسلام کو دوبارہ وہی برتری اور سر بلندی حاصل ہو جو ماضی میں اسے حاصل تھی۔

مگر ان امکانات کو واقعہ بنانے کے لئے ایک ایسی سنجیدہ جدوجہد درکار ہے جو وقت کے گہرے شعور پر ابھری ہو۔ جو ردعمل کی نفسیات سے پاک ہو کر مثبت عمل کرنا جانتی ہو۔ جو ہر دوسرے احساس کو قربان کر کے صرف دین کی سر بلندی کے لئے کوشش کرنے والی ہو۔ جو ربانی حکمت کی رہنمائی میں اٹھی ہو نہ کہ انسانی کج فہمیوں کی بنیاد پر۔ جس کا محرک خدا کی بڑائی قائم کرنا ہو نہ کہ قومی فخر اور مادی عظمت کا جھنڈا لہرانا۔ ایسے ہی لوگوں نے پہلے بھی خدا کے دین کو سر بلند کیا تھا اور ایسے ہی لوگ آج بھی خدا کے دین کو سر بلند کریں گے۔ اس کے برعکس جو لوگ سطحی نعروں پر بھیڑ جمع کرنے کو کام سمجھیں، جو ہر پیش آمدہ مسئلہ پر دوڑنا شروع کر دیں، وہ صرف خدا کے پیدا کئے ہوئے امکانات کو برباد کریں گے۔ وہ ان امکانات کو واقعہ بنانے والے ثابت نہیں ہو سکتے۔

ایک تقابل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو اسلامی انقلاب آیا اس میں تاریخی روایات کے مطابق کل ۱۰۱۸ آدمی ہلاک ہوئے۔ اس انقلاب کی تکمیل ۲۳ سال میں ہوئی۔ ان ۲۳ سالوں میں جو غزوات پیش آئے ان کی تعداد ۸۱ بتائی جاتی ہے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف ۲۷ غزوات میں شریک تھے اور عملاً باقاعدہ جنگ صرف چند ہی غزوات میں پیش آئی۔ ان لڑائیوں میں مجموعی طور پر ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس طرح ہے:

مسلمان مقتولین	۲۵۹
غیر مسلم مقتولین	۷۵۹ = ۱۰۱۸

صدر اول کا یہ انقلاب تاریخ کا عظیم ترین انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا۔ اتنے بڑے انقلاب میں مقتولین کی یہ تعداد اتنی کم ہے کہ اس کو غیر خونی انقلاب (Bloodless Revolution) کہا جاسکتا ہے۔

ہمارے لکھنے اور بولنے والے اکثر پُر جوش انداز میں اس انقلاب کا مقابلہ موجودہ زمانہ کے غیر اسلامی انقلابات سے کرتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب صرف ایک ہزار آدمیوں کی جان لے کر کامیاب ہوگیا۔ جبکہ فرانس میں جمہوری انقلاب لانے کے لئے اور روس میں اشتراکی انقلاب لانے کے لئے اتنے زیادہ آدمیوں کو قربان ہونا پڑا جن کی تعداد لاکھوں میں شمار ہوتی ہے۔

یہ تقابل ہم کو بہت پسند ہے کیونکہ اس میں ہماری پُر فخر نفسیات کو تسکین ملتی ہے۔ مگر یہاں تقابل کی ایک اور صورت ہے جس پر مسلمانوں نے کبھی غور نہیں کیا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ دوسرا تقابل نصیحت کا تقابل ہے اور نصیحت آدمی کے لئے ہمیشہ بہت کڑوی ہوتی ہے۔

یہ دوسرا تقابل یہ ہے کہ آپ صدر اول کی اسلامی دعوت میں مرنے والے کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں میں مرنے والوں سے کریں۔ بالفاظ دیگر، صدر اول کے انقلاب سے خود اپنی انقلابی کوششوں کا موازنہ کریں۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانہ میں دینی انقلاب اور اسلامی جہاد کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھائی ہیں۔ مسلمان جس طرح زمانہ رسالت کے دینی انقلاب کا تقابل غیر مسلموں کے لادینی انقلابات سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انھیں چاہئے کہ وہ زمانۂ رسالت کے انقلاب کو سامنے رکھ کر خود اپنی اٹھائی ہوئی تحریکوں کو تولیں اور ان کے نتائج کا جائزہ لیں۔

اگر مسلمان یہ تقابل کریں تو وہ حیرت انگیز طور پر پائیں گے کہ انھوں نے پیغمبر کی تحریک کے مقابلہ میں دوسری اقوام کی لادینی تحریکوں کو جس مقام پر کھڑا کر رکھا ہے، عین اسی مقام پر خود ان کی موجودہ زمانہ کی تحریکیں بھی کھڑی ہوئی ہیں ——— الجزائر کے جہاد آزادی میں ۲۵ لاکھ مسلمان مرے، ہندستان کے جہاد آزادی میں ۵ لاکھ علماء اور مسلمان شہید ہوئے، اسلامی پاکستان کو وجود میں لانے کے درمیان ایک کروڑ انسان کام آگئے۔ اسی طرح شام، عراق، ایران، مصر، فلسطین اور دوسرے علاقوں میں جو لوگ اسلام کے نام پر جانیں دے رہے ہیں ان کی تعداد لاکھوں سے بھی زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ ان تمام قربانیوں کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ صدر اول کی اسلامی تحریک میں دس سو آدمی کام آئے، اور اس کے بعد ایسا دوررس انقلاب آیا جس کے اثرات ساری دنیا نے محسوس کر لئے۔

موجودہ زمانہ کی اسلامی تحریکوں میں مجموعی طور پر دس کروڑ آدمی ہلاک اور برباد ہو گئے۔ اس کے باوجود زمین کے اوپر کوئی ایک چھوٹا سا خطہ بھی نہیں جہاں اسلامی انقلاب حقیقی معنوں میں کامیاب اور نتیجہ خیز نظر آتا ہو۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ سخت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری کوششوں کا بالکل الٹا نتیجہ برآمد ہوا ہے۔ ہمارے حق میں بائبل کے وہ الفاظ پورے ہوئے ہیں جو یہود کے بارے میں کہے گئے تھے ——— "اور تمہارا بیج بونا فضول ہوگا کیونکہ تمہارے دشمن اس کی فصل کھائیں گے۔ اور جن کو تم سے عداوت ہے وہی تم پر حکمرانی کریں گے۔ اور تمہاری قوت بے فائدہ صرف ہوگی کیونکہ تمہاری زمین سے کچھ پیدا نہ ہوگا۔ اور میدان کے درخت پھلنے ہی کے نہیں۔" (احبار، باب ۲۶)

ہماری جدید تاریخ ان الفاظ کے عین مصداق ثابت ہو رہی ہے۔ ہم نے خلافت اسلامی اور اتحاد عالمی کی دھواں دھار تحریکیں چلائیں اور اس کی راہ میں ان گنت قربانیاں دیں۔ مگر جب نتیجہ نکلا تو ساری مسلم دنیا بہت سی قومی حکومتوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہم نے آزادیٔ وطن کے لئے جہاد کیا مگر جب وطن آزاد ہوا تو عملاً وہ دوسرے فرقوں کے قبضہ میں چلا گیا۔ ہم نے اسلامی پاکستان وجود میں لانے کے لئے قربانیاں دیں مگر جب اسلامی پاکستان بنا تو وہاں غیر اسلامی لیڈروں کی حکومت قائم تھی۔ ہم نے مصر میں اسلامی اقتدار قائم کرنے کے لئے عظیم الشان تحریک اٹھائی مگر جب مصر کی قسمت کا فیصلہ ہوا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی حوصلہ مندوں کے ہاتھ میں جا چکا تھا۔ تقریباً ثلث صدی سے فلسطین کی یہودی ریاست کو مٹانے کے لئے جہاد جاری ہے اور مسلمانوں کا جان و مال بے پناہ مقدار میں تباہ ہو رہا ہے مگر عملاً صرف یہ ہوا ہے کہ یہودی ریاست کی قوت اور وسعت میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری دردناک خبر جو بہت جلد مسلمانوں کو سننی ہوگی وہ یہ کہ ایران میں ناقابل بیان قربانیوں کے بعد اسلامی اقتدار لایا گیا مگر یہ اسلامی اقتدار بہت جلد ملحد طاقتوں کا اقتدار قائم ہونے کا ابتدائی زینہ بن گیا۔

یہ موجودہ زمانہ کی پتھر سے بھی زیادہ سنگین حقیقتیں ہیں۔ کوئی شخص یہ کر سکتا ہے کہ اپنے ذہن میں خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا کر اس میں جیتا رہے مگر آئندہ آنے والا مورخ یقیناً ہماری خوش خیالیوں کی تصدیق نہیں کرے گا۔ وہ یہ لکھنے پر مجبور ہوگا کہ فرانس اور روس کے انقلاب میں مرنے والوں کے حصہ میں پھر بھی یہ فائدہ آیا کہ انھوں نے عالمی فکر کا دھارا موڑ دیا۔ اس کے بعد دنیا میں شہنشاہی طرز فکر کے بجائے جمہوری طرز فکر رائج ہو گیا اور سرمایہ دارانہ طریق معیشت پر سوشلسٹ طریق معیشت کو فکری غلبہ حاصل ہو گیا۔ مگر اسلام کے نام پر برباد ہونے والے اگرچہ تعداد میں ان سے بھی زیادہ تھے مگر وہ عالمی فکر پر کسی قسم کا اثر نہ ڈال سکے۔

صدر اول کا اسلامی انقلاب بتاتا ہے کہ اگر ایک ہزار آدمی بھی یہ ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کے دین کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار ہیں تو خدا ان کی قربانی کو قبول کر کے اسلام کو زمین پر غالب کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کروروں آدمیوں نے قربانی کا ثبوت دیا مگر خدا کی نصرت ان کا ساتھ دینے کے لئے آسمان سے نہیں اتری۔ وہ اس کے باوجود مغلوب ہی بنے رہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہماری یہ تمام قربانیاں حقیقۃً اس صراطِ مستقیم کے مطابق نہ تھیں جس کی پیروی پر خدا نے نصر عزیز اور فتح مبین کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح)

کوئی کسان اگر کہے کہ میں نے گیہوں کے بیج زمین میں ڈالے مگر اس سے گیہوں اگنے کے بجائے جھاڑ جھنکاڑ اُگے تو ایسا کسان جھوٹ بولتا ہے۔ کیونکہ خدا کی اس دنیا میں یہ ممکن ہی نہیں کہ آدمی گیہوں کے بیج بوئے اور اس سے اس کے لئے جھاڑ جھنکاڑ اگے۔ یہ ناممکن ہے، یہ کرور بار ناممکن ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں ہماری قربانیاں اگر فی الواقع اس راہ پر ہوتیں جس راہ پر رسول اور اصحاب رسول چلے اور اپنی جانیں دیں تو ناممکن تھا کہ اتنی غیر معمولی کوششوں کے باوجود اس کا کوئی مثبت نتیجہ نہ نکلے۔ واقعات کا یہ کھلا ہوا فیصلہ ہے۔ اگر اس کے باوجود کوئی آدمی خوش فہمی کے گنبد میں رہنا چاہے تو رہے۔ بہت جلد قیامت اس کے گنبد کو توڑ دے گی۔ اس کے بعد وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے لئے جھوٹی خوش فہمیوں کے کھنڈر کے سوا اور کچھ نہیں۔

نصرت خداوندی

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمھاری مدد کرے گا۔ اور تمھارے قدموں کو جما دے گا (یا ایھا الذین آمنوا ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم، محمد ۷)

یہاں خدا کی نصرت کرنے سے مراد خدا کی اسکیم کے ساتھ موافقت ہے، یعنی واقعات کو ظہور میں لانے کے لئے خدا کا جو نقشہ ہے اور اس کے لئے اس نے جو موافق حالات فراہم کئے ہیں ان کے ساتھ اپنی کوششوں کو جوڑ دینا، جو لوگ اس طرح خدا کی نصرت کریں ان کو جماؤ حاصل ہوتا ہے اور بالآخر وہ کامیاب رہتے ہیں۔ خدا کی اس دنیا میں خدائی منصوبہ سے مطابقت کرکے ہی کوئی نتیجہ حاصل کیا جا سکتا ہے نہ کہ بطور خود آزادانہ عمل کرکے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ ایک پادری صاحب اپنے مکان کے سامنے ایک ہرا بھرا درخت دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے سوچا کہ اگر میں اس کا بیج بوؤں تو وہ دس سال میں پورا درخت بنے گا۔ انھوں نے ایسا کیا کہ کہیں سے ایک بڑا درخت کھدوایا پھر کئی آدمیوں کے ذریعہ اس کو وہاں سے اٹھوایا اور اس کو لاکر اپنے گھر کے سامنے لگادیا۔ وہ خوش تھے کہ انھوں نے دس سال کی مدت ایک دن میں طے کرلی ہے، لیکن اگلے دن جب وہ صبح کو سوکر اٹھے تو ان کو یہ دیکھ کر بڑا صدمہ ہوا کہ درخت کے پتے مرجھا چکے ہیں۔ شام تک شاخیں بھی لٹک گئیں۔ چند دن کے بعد درخت کے پتے سوکھ کر جھڑ گئے اور اس کے بعد ان کے گھر کے سامنے صرف لکڑی کا ایک ٹھنٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انھیں دنوں پادری صاحب کا ایک دوست ان سے ملنے کے لئے آیا۔ دوست نے دیکھا کہ پادری صاحب اپنے گھر کے سامنے بے چینی کے ساتھ ٹہل رہے ہیں۔ اس نے کہا، آج میں آپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ رہا ہوں، آخر کیا بات ہے۔ پادری صاحب نے جواب دیا —— میں جلدی میں ہوں مگر خدا جلدی نہیں چاہتا:

I am in hurry, but God doesn't

اس کے بعد پادری صاحب نے درخت کے مذکورہ قصہ کو بتاتے ہوئے کہا کہ دنیا میں جو واقعات ہوتے ہیں ان میں ایک حصہ خدا کا ہوتا ہے اور ایک حصہ انسان کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دندانہ دار پہیوں (Cog Wheels) کے ملنے سے مشین کا چلنا۔ ایک پہیہ خدا کا ہے، دوسرا پہیہ انسان کا۔ انسان جب خدا کے پہیہ کا ساتھ دیتا ہے تو وہ کامیاب رہتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خدا کے پہیے کی رفتار کا لحاظ کئے بغیر چلنا چاہے تو وہ ٹوٹ جائے گا کیونکہ خدا کا پہیہ مضبوط ہے اور انسان کا پہیہ کمزور۔

خدا نے کروروں سال کے عمل سے زمین کے اوپر زرخیز مٹی کی تہ بچھائی جس کے اوپر کوئی درخت اگے۔ سورج کے ذریعہ اوپر سے ضروری حرارت بھیجی۔ آفاقی اہتمام کے تحت پانی مہیا فرمایا۔ موسموں کی تبدیلی کے ذریعہ اس کی پرورش کا انتظام کیا۔ کھرب با کھرب کی تعداد میں بیکٹیریا پیدا کئے جو درخت کی جڑوں کو نائٹروجن کی غذا فراہم کریں۔ یہ تمام انتظام گویا خدا کا دندانہ دار پہیہ (Cog Wheel) ہے۔ اب انسان کو اس میں اپنا دندانہ دار پہیہ ملانا ہے تاکہ مذکورہ مواقع اس کے لئے درخت کی صورت اختیار کرسکیں۔ انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ ایک بیج لے اور اس کو زمین میں دبا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو گویا اس نے خدا کے پہیے میں اپنے پہیے کو ملایا۔ اس کے بعد فطرت کی مشین چلنا شروع ہو جائے گی اور وقت پر اپنا نتیجہ دکھائے گی۔ اس کے برعکس اگر انسان اپنا بیج پتھر پر ڈال دے، یا بیج کے بجائے اس کے ہم شکل پلاسٹک کے دانے زمین میں بوئے۔ یا وہ ایسا کرے کہ بیج بونے کے بجائے پورا درخت اکھاڑ کر لائے اور اس کو اپنی زمین میں اچانک کھڑا کرنا چاہے تو گویا اس نے اپنا پہیہ خدا کے پہیے میں نہیں ملایا، اس نے اپنے آپ کو خدا کے منصوبے میں شامل نہیں کیا۔ ایسے آدمی کے لئے اس دنیا میں ہرے بھرے درخت کا مالک بننا مقدر نہیں۔

یہی معاملہ اسلامی انقلاب کا بھی ہے۔ وہ بھی خدا کے پیدا کردہ مواقع کو سمجھنے اور ان کو استعمال کرنے سے ظہور میں آتا ہے، نہ کہ خود ساختہ قسم کی اچھل کود مچانے سے۔ صدر اول میں جو انقلاب آیا وہ اس لئے آیا کہ خدا کے کچھ بندوں نے اپنا پہیہ خدا کے پہیہ میں ملا دیا۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں ہماری تمام قربانیاں اس لئے رائگاں چلی گئیں کہ ہم نے خدائی منصوبہ کے ساتھ موافقت نہیں کی بلکہ خود ساختہ راہوں میں غیر متعلق قسم کی

ہنگامہ آرائیاں کرتے رہے۔

دین توحید اور دین شرک

قرآن کے اشارات (البقرہ ۲۱۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے بعد جب انسان زمین پر آباد ہوا تو سب کا دین توحید تھا۔ یہ صورت چند سو سال تک جاری رہی۔ اس کے بعد لوگوں کے اندر مظاہر پرستی کا آغاز ہوا جس کا دوسرا نام شرک ہے۔ دکھائی نہ دینے والے خدا کو اپنا مرکز توجہ بنانا انسان کے لئے مشکل تھا، چنانچہ اس نے عقیدۃً خدا کو مانتے ہوئے یہ کیا کہ دکھائی دینے والی چیزوں کو اپنا مرکز توجہ بنا لیا۔ یہی وہ دور ہے جب کہ سورج، چاند اور ستاروں کی پرستش شروع ہوئی۔ پہاڑوں اور سمندروں کو دیوتا سمجھ لیا گیا۔ حتیٰ کہ انسانوں میں سے جس کے پاس عظمت و اقتدار نظر آیا اس کو بھی خدا کا شریک فرض کر لیا گیا۔ اس طرح تقریباً ایک ہزار سال بعد وہ وقت آیا جب کہ توحید کا فکری غلبہ ختم ہو گیا۔ اور انسانی ذہن پر دین شرک غالب آ گیا۔

ابتدائی دین توحید میں اس بگاڑ کے بعد خدا نے اپنے پیغمبر بھیجنے شروع کئے۔ مگر ان پیغمبروں کو کبھی اتنی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی کہ دین شرک کو مٹا کر دوبارہ دین توحید کو غالب اور سر بلند کرتے۔ انسانی نسل اس زمانہ میں جن جن مقامات پر پھیلی تھی، ہر مقام پر خدا کے پیغمبر لگاتار آتے رہے (المومنون ۴۴) ایک حدیث کے مطابق ان پیغمبروں کی تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ تھی۔ مگر تمام پیغمبروں کا یہ حال ہوا کہ ان کو استہزاء کا موضوع بنا لیا گیا (یس ۳۰)

جب آدمی سچائی کا انکار کرتا ہے، بلکہ اس کا مذاق اڑانے پر اتر آتا ہے تو یہ خواہ مخواہ نہیں ہوتا۔ ایسا رویہ آدمی ہمیشہ کسی چیز کے بل پر اختیار کرتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ناز ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فلما جاءتهم رسلهم بالبينات فرحوا بما عندهم من العلم وحاق بهم ما كانوا به يستهزؤن	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل لے کر آئے تو وہ اس علم پر مگن رہے جو ان کے پاس تھا اور ان کو گھیر لیا اس چیز نے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔
المومن ۸۳	

یہاں "علم" سے مراد وہ بگڑا ہوا مذہب ہے جو زمانہ گزرنے کے بعد ان قوموں کے نزدیک مقدس بن گیا تھا۔ اس قسم کا آبائی مذہب ہمیشہ ایک قائم شدہ مذہب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مانے ہوئے بزرگوں کے نام وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے ادارے چل رہے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر ان کا پورا قومی ڈھانچہ کھڑا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو لمبی روایات کے نتیجہ میں عظمت کا سب سے اونچا مقام مل چکا ہوتا ہے۔

ان قوموں کے پاس ایک طرف ان کا یہ مسلمہ مذہب تھا جو شرک کی بنیاد پر قائم تھا۔ دوسری طرف پیغمبر ایک ایسی توحید کی آواز بلند کرتا جو وقت کے ماحول میں اجنبی ہوتی تھی۔ اس کا داعیٔ حق ہونا ایک ایسے

دعوے کی حیثیت رکھتا تھا جس کی پشت پر ابھی تاریخ کی تصدیقات جمع نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے پاس اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے لفظی دلیل کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس تقابل میں انھیں وقت کا پیغمبر واضح طور پر حقیر نظر آتا اور ان کا اپنا آبائی مذہب واضح طور پر عظیم۔ حضرت مسیح بے گھر تھے اور درخت کے نیچے سوتے تھے۔ دوسری طرف یہودیوں کا مذہبی سردار ہیکل کی عظیم عمارت میں جلوہ افروز تھا۔ پھر ہیکل کے صدر نشین کے مقابلہ میں درخت کے نیچے سونے والا لوگوں کو زیادہ برسرِ حق کیسے نظر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قومیں اپنے معاصر پیغمبروں کو استہزار کا موضوع بناتی رہیں۔ اس استہزار پر جو چیز انھیں آمادہ کرتی وہ ان کا یہ احساس تھا کہ ہم تو مسلّمہ اکابر کا دامن تھامے ہوئے ہیں، پھر ان کے مقابلہ میں اس معمولی آدمی کی کیا حیثیت۔ اکابر کی اس فہرست میں اگرچہ قدیم انبیار تک ہوتے تھے۔ مگر ان انبیار کی حیثیت عملاً ان کے یہاں ایک قسم کے قومی ہیرو کی تھی نہ کہ فی الواقع داعیٔ حق کی۔

اعلار کلمۃ اللہ

آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑکوں کے چوراہے پر کھمبا لگا ہوتا ہے جس میں ہری اور لال روشنیاں ہوتی ہیں۔ جس رخ پر ہری روشنی ہو ادھر سواریوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ اور جس رخ پر لال روشنی ہو رہی ہو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ادھر سواریاں نہ جائیں۔ اگر کوئی سواری اس نشان دہی کی خلاف ورزی کرے تو وہ ٹریفک قوانین کے مطابق قابل سزا قرار پاتی ہے۔

داعیٔ حق کی حیثیت اصلاً اسی قسم کے رہنما کھمبا کی ہے۔ وہ خدا کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے کہ زندگی کے راستوں پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بتائے کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ کون سا راستہ جنت کی طرف جا رہا ہے اور کون سا جہنم کی طرف۔ (وکذلک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً)

ابتدائی دور توحید کے بعد غلبۂ شرک کے زمانے میں خدا کی طرف سے جو رسول آئے وہ اسی خاص مقصد کے لئے آئے۔ ان کو خدا نے حقیقت کا صحیح علم دے کر کھڑا کیا کہ وہ قوموں کی رہنمائی کریں اور ان کو یہ بتائیں کہ کہ دنیا کی زندگی میں ان کے لئے صحیح کیا ہے اور غلط کیا۔ ہر نبی نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح انجام دیا۔ انھوں نے ان کی قابلِ فہم زبان میں دلائل کی پوری قوت کے ساتھ لوگوں کے سامنے حق کو پیش کیا اور مسلسل اتنی وضاحت کی کہ ان کے مخاطبین کے سامنے اتمام حجت کی حد تک خدا کا پیغام پہنچ گیا پھر جس نے رسول کا ساتھ دیا وہ خدا کے نزدیک جنتی ٹھہرا۔ جس نے رسول کو نہ مانا وہ سرکش اور باغی قرار دے کر جہنم میں ڈال دیا گیا۔

تاہم اللہ تعالیٰ کو حق کے اعلان کے ساتھ یہ بھی مطلوب تھا کہ دوبارہ حق کا اظہار ہو۔ حق کا اعلان تو یہ ہے

کہ لوگوں کو حق کے بارے میں پوری طرح بتا دیا جائے۔ خیر خواہی اور حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بات کو اس طرح کھول دیا جائے کہ سننے والوں کے لئے یہ کہنے کی گنجائش نہ رہے کہ ہم اس سے بے خبر تھے۔ ہم یہ جانتے ہی نہ تھے کہ زندگی میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ اسی کا نام اتمام حجت ہے۔

اظہار اس سے آگے کی چیز ہے۔ اظہار کا مطلب یہ ہے کہ دینی فکر دنیا کا غالب فکر بن جائے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے افکار پست اور مغلوب ہو کر رہ جائیں۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اعلاء کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ اظہار دین یا اعلاء کلمۃ اللہ سے مراد اصلاً حدود و قوانین کا نفاذ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد فکری غلبہ ہے۔ یعنی اسی قسم کا غلبہ جیسا غلبہ موجودہ زمانہ میں جدید علوم کو قدیم روایتی علوم پر حاصل ہوا ہے۔ مثلاً سرمایہ داری پر سوشلزم کا فکری غلبہ، شہنشاہیت پر جمہوریت کا فکری غلبہ اور قیاسی فلسفہ پر تجرباتی سائنس کا فکری غلبہ۔ جدید سائنسی دنیا میں بعض علوم نے غالب علم کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اور بعض دوسرے علوم نے ان کے مقابلہ میں اپنی برتری کھو دی ہے۔ اسی قسم کا غلبہ دین حق کا بھی دین باطل کے اوپر مطلوب ہے۔

خدا قادر مطلق ہے۔ اس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ حق کو دوسری باتوں پر فائق و برتر کر دے جس طرح اس نے سورج کی روشنی کو دوسری تمام زمینی روشنیوں پر فائق کر رکھا ہے۔ مگر موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں خدا اپنے مطلوب واقعات کو اسباب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے نہ کہ معجزات کے روپ میں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ اسباب کے دائرہ میں اس مقصد کے لئے تمام ضروری حالات پیدا کئے جائیں اور اس کے بعد ایک ایسا پیغمبر بھیجا جائے جس کو خصوصی طور پر غلبہ کی نسبت دی گئی ہو۔ وہ اپنے آپ کو خدا کے منصوبہ میں شامل کر کے نہ صرف حق کا اعلان کرے بلکہ حق کا اظہار بھی کر دے تاکہ خدا کے بندوں پر خدا کی نعمت کا اتمام ہو اور ان پر ان برکتوں کے دروازے کھلیں جو ان کی نادانی سے ان کے اوپر بند پڑے ہوئے ہیں۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن کی ان آیتوں میں کہی گئی ہے:

یریدون لیطفئوا نور اللہِ بافواھھم واللہ متمّ نورہٖ ولوکرہَ الکفرون ○ ھوَ الذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحقِّ لیظھرہ علی الدین کلہٖ ولوکرہَ المشرکون ○

الصف ۸ ـ ۹

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا خواہ وہ منکروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام دین پر غالب کر دے خواہ وہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو

ایک نئی قوم برپا کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انا دعوۃ ابراھیم (میں ابراہیم کی دعا ہوں) حضرت ابراہیم

نے کعبہ کی تعمیر کے وقت یہ دعا کی تھی کہ اے خدا تو میرے لڑکے اسمٰعیل کی اولاد میں ایک نبی پیدا کر (البقرہ ۱۲۹ تاہم حضرت ابراہیم کی دعا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے درمیان تقریباً ڈھائی ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت زکریا نے اپنی اولاد میں ایک پیغمبر پیدا کئے جانے کی دعا کی تو ایک سال کے اندر ہی آپ کے یہاں حضرت یحییٰ پیدا ہو گئے (آل عمران ۳۹) اور حضرت ابراہیم نے اسی قسم کی دعا فرمائی تو اس کی عملی قبولیت میں ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ اس فرق کی وجہ کیا تھی۔

اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ حضرت یحییٰ کو ایک وقتی کردار ادا کرنا تھا۔ آپ اس لئے بھیجے گئے کہ یہود کے دینی بھرم کو کھولیں اور بالآخر ان کے ہاتھوں قتل ہو کر یہ ثابت کریں کہ یہود اب اتنا بگڑ چکے ہیں کہ انھیں معزول کر دیا جائے اور ان کی جگہ دوسری قوم کو کتاب الٰہی کا حامل بنایا جائے۔ اس کے مقابلہ میں پیغمبر اسلام کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب فکر کی حیثیت دے دیں۔ اس کام کو اسباب کے ڈھانچہ میں انجام دینے کے لئے ایک نئی صالح قوم اور موافق حالات درکار تھے۔ یہی وہ قوم اور یہی وہ حالات ہیں جن کو وجود میں لانے کے لئے ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔

اس منصوبہ کے تحت حضرت ابراہیم کو حکم ہوا کہ وہ عراق کے متمدن علاقہ سے نکلیں اور حجاز کے خشک اور غیر آباد مقام پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو لاکر بسا دیں (ابراہیم ۳۷) یہ مقام اس وقت وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کی وجہ سے دنیا سے الگ تھلگ تھا۔ یہاں تمدنی آلائشوں سے دور رہ کر خالص فطرت کی آغوش میں ایک ایسی قوم کی تعمیر کی جاسکتی تھی جس کے اندر خدا کی پیدا کی ہوئی فطری صلاحیتیں محفوظ ہوں۔ (ربنا واجعلنا مسلمینِ لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک، البقرہ ۱۲۸) قبولیت دعا میں ڈھائی ہزار سالہ تاخیر کا واضح مطلب یہ تھا کہ مخصوص ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ وہ جاندار قوم وجود میں آئے جو خدا کے دین کی بھی حامل بن سکے۔ جو پورے معنوں میں ایک جان دار قوم ہو اور ان تمام مصنوعی کمیوں سے پاک ہو جن کی وجہ سے دور اول میں خدا کے دین کے اظہار کے لئے کار آمد آدمی نہ مل سکے۔ جب منصوبہ کے مطابق مکمل اسٹیج تیار ہو گیا اس وقت بنو ہاشم کے یہاں آمنہ بنت وہب کے پیٹ سے وہ پیغمبر غلبہ پیدا کر دیا گیا جس کی دعا حضرت ابراہیم کی زبان پر جاری ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیم نے خدا کے حکم سے ہاجرہ اور اسمٰعیل کو موجودہ مکہ کے مقام پر لاکر بسا دیا جہاں اس وقت سوکھی زمین اور خشک پتھروں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ جب مشک کا پانی ختم ہو گیا اور اسماعیل پیاس کی شدت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے تو خشک بیابان میں زمزم کا چشمہ نکل آیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ خدا نے اگرچہ تم کو بڑے سخت محاذ پر کھڑا کیا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرے گا کہ تم کو بے سہارا چھوڑ دے۔ تمہارا معاملہ خدا

کا معاملہ ہے اور خدا ہر نازک موڑ پر تمھاری مدد کے لئے موجود رہے گا۔ اسماعیل جب نوجوانی کی عمر کو پہنچے تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ اس خواب کو انھوں نے حکم خداوندی سمجھا اور بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے مگر عین اس وقت جب کہ ان کی چھری اسماعیل کے گلے پر پہنچ چکی تھی خدا نے آواز دے کر انھیں روک دیا اور اس کے بدلے انھیں ایک مینڈھا دیا جس کو وہ خدا کے نام پر ذبح کریں۔ یہ اس بات کا مظاہرہ تھا کہ تم سے اگرچہ ہم نے بہت بڑی قربانی مانگی ہے مگر یہ صرف جذبہ کا امتحان ہے۔ قربانی پیش تو کرنا ہوگا مگر ابھی قربان ہونے کی نوبت نہیں آئے گی کہ خدا تمھیں بچا لے گا۔ کیونکہ اصل مقصد تم کو ایک بڑے کام کے لئے استعمال کرنا ہے نہ کہ خواہ مخواہ ہلاک کر دینا۔

حضرت اسماعیل بڑے ہوئے تو انھوں نے قبیلۂ جرہم کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو زمزم نکلنے کے بعد آکر مکہ میں آباد ہو گیا تھا۔ حضرت ابراہیم جو اس وقت شام میں تھے، ایک روز گھوڑے پر سوار ہو کر آئے اس وقت گھر پر اسماعیل نہ تھے، صرف ان کی بیوی موجود تھیں جو اپنے خسر کو پہچانتی نہ تھیں، حضرت ابراہیم نے پوچھا کہ اسماعیل کہاں گئے ہیں، بیوی نے کہا کہ شکار کرنے کے لئے۔ پھر پوچھا کہ تم لوگوں کی گزر کیسی ہوتی ہے۔ بیوی نے معاشی تنگی اور گھر کی ویرانی کی شکایت کی، اس کے بعد حضرت ابراہیم واپس چلے گئے اور خاتون سے کہا کہ جب اسماعیل آئیں تو ان سے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ اپنی چوکھٹ کو بدل دو (غیر عتبۃ بابك) حضرت اسماعیل نے واپسی کے بعد جب پورا واقعہ سنا تو انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ میرے باپ تھے جو ہمارا حال دیکھنے آئے تھے اور "چوکھٹ بدل دو" کا مطلب استعارے کی زبان میں یہ ہے کہ اس بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کر و، کیونکہ وہ اس نسل کو پیدا کرنے کے لئے موزوں نہیں جس کا منصوبہ خدا نے بنایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس بیوی کو طلاق دے دی اور دوسری عورت سے شادی کر لی۔ اس کے کچھ دن بعد حضرت ابراہیم دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے، اب بھی اسماعیل گھر پر موجود نہ ملے۔ حضرت ابراہیم نے دوسری بیوی سے بھی وہی سوال کیا جو انھوں نے پہلی بیوی سے کیا تھا۔ اس بیوی نے اسماعیل کی تعریف کی اور کہا کہ جو کچھ ہے بہت اچھا ہے، سب خدا کا شکر ہے، اس کے بعد حضرت ابراہیم یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ اسماعیل آئیں تو ان کو میرا سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ چوکھٹ کو قائم رکھو (ثبت عتبۃ بابك) یعنی تمھاری یہ بیوی پیش نظر منصوبہ کے لئے بالکل ٹھیک ہے، اس کے ساتھ اپنا تعلق باقی رکھو (تفسیر ابن کثیر)

اس طرح عرب کے الگ تھلگ علاقے میں اسماعیل کے ابتدائی خاندان سے ایک نئی نسل بننا شروع ہوئی جس نے بالآخر اس جاندار قوم (بنو اسماعیل) کی صورت اختیار کی جو نبی آخر الزماں کا گہوارہ بن سکے اور تاریخ کی اس عظیم ترین ذمہ داری کو سنبھالے جو خدا اس کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

یہ قوم جو عرب کے صحراؤں اور چٹیل بیابانوں میں تیار ہوئی، اس کی خصوصیات کو ایک لفظ میں المروۃ کہا جاسکتا ہے۔ المروۃ کے لفظی معنی ہیں مردانگی۔ یہ عربوں کے یہاں کسی کے جوہر انسانیت کو بتانے کے لئے سب سے اونچا لفظ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم عربی شاعر کہتا ہے:

اذا المرء اعیته المروۃ ناشئا　　فمطلبها کھلا علیہ شدید

(آدمی اگر اٹھتی جوانی میں مردانگی کا مقام حاصل کرنے سے عاجز رہ جائے تو بڑھاپے میں اس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے)

پروفیسر فلپ ہٹی نے عرب تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عرب کے بیابانوں میں صدیوں کے عمل سے جو قوم تیار ہوئی وہ دنیا کی ایک نرالی قوم تھی جو مندرجہ ذیل اخلاقی صفات میں کمال درجہ رکھتی تھی:

> Courage, endurance in time of trouble (sabr) observance of the rights and obligations of neighbourliness (jiwar) manliness (muruah) generosity and hospitality, regard for women and fulfilment of solemn promises. (P. 253)

ہمت، مشکل کے وقت برداشت، پڑوسی کے حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی، مردانگی، فیاضی اور مہمان نوازی، عورتوں کی عزت اور وعدہ کر لینے کے بعد اسے پورا کرنا۔

خیر امت

اس طرح ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ ایک ایسی قوم نکالی گئی جو اپنے انسانی اوصاف کے اعتبار سے تمام قوموں میں سب سے بہتر تھی (کنتم خیر امۃ اخرجت للناس، آل عمران ۱۱۰) حضرت عبداللہ بن عباس نے خیر امت سے مہاجرین کا گروہ مراد لیا ہے (ھم الذین ھاجروا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ الی المدینۃ، تفسیر ابن کثیر) مہاجرین دراصل اس گروہ کی علامت تھے۔ باعتبار حقیقت اس سے وہ پورا عرب گروہ مراد ہے جس کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔

پیغمبروں کو ہر زمانہ میں ایک ہی سب سے بڑی رکاوٹ پیش آئی ہے۔ ان کی مخاطب قوموں کے پاس جو آبائی دین ہوتا تھا اس کے ساتھ مادی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں شامل ہوتی تھیں۔ دوسری طرف وقت کا پیغمبر دلیل مجرد کی سطح پر کھڑا ہوتا تھا۔ عرب میں جو قوم تیار ہوئی اس کے اندر یہ انوکھی صفت تھی کہ وہ حق کو دلیل مجرد کی سطح پر پا سکے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسے حق کے حوالے کر دے جس نے ابھی ظواہر کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ کھلے آسمان اور وسیع صحراؤں کے درمیان جو قوم تیار ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر اپنے اندر یہ صلاحیت رکھتی تھی کہ حقیقت کو اس کے بے آمیز روپ میں دیکھ سکے، وہ ایک ایسے حق کے لئے اپنا سب کچھ سونپ دے جس سے بظاہر دنیا میں کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ اصحاب رسول کی اس خصوصیت کو حضرت عبداللہ بن مسعود نے تین

لفظوں میں اس طرح ادا کیا ہے: وہ اس امت کے سب سے افضل لوگ تھے۔ وہ سب سے زیادہ نیک دل، سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے اور سب سے کم تکلف والے تھے۔ اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت اور دین کے قیام کے لئے چن لیا تھا (کانوا افضل هذه الامة ابرّها قلوبا واعمقها علما واقلها تكلفا اختارهم الله لصحبة نبيه ولاقامة دينه)

دور شرک میں انسان سے سب سے اہم صفت جو کھوئی گئی تھی، وہ تھی ـــــــ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت۔ اب انسان حقیقت کو محسوسات اور مظاہر کی سطح پر دیکھتا تھا، وہ حقیقت کو مجرد سطح پر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا۔ یہی اصل رکاوٹ تھی جس کی وجہ سے پچھلے زمانے میں نبیوں کا مذاق اڑایا جاتا رہا۔

وہ خدا کے منکر نہ تھے مگر انھوں نے خدا کو محسوسات کے پیکر میں ڈھال لیا تھا۔ وہ غیب میں چھپے ہوئے خدا کو سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس لئے انھوں نے نظر آنے والی چیزوں کو خدائی کا پیکر فرض کر کے ان کو اپنا مرکز توجہ بنالیا تھا، خواہ یہ مادی بڑائیاں ہوں یا انسانی بڑائیاں۔ ان کی یہی کمزوری پیغمبر کی پیغمبری پر یقین کرنے میں مانع تھی۔ ہر پیغمبر جب آتا ہے تو اپنے زمانہ کے لوگوں کے لئے وہ محض ایک انسان ہوتا ہے۔ ابھی اس کے نام کے ساتھ وہ تاریخی بڑائیاں شامل نہیں ہوتیں جو بعد کے دور میں اس کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی دعا میں فرمایا تھا: اے میرے رب، اس شہر (مکہ) کو تو امن والا شہر بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔ اے میرے رب، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا۔ پس جس نے میری پیروی کی وہ میرا ہے اور جس نے میرا کہنا نہ مانا تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔ اے میرے رب، میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں بسایا ہے جہاں کھیتی نہیں، تیرے محترم گھر کے پاس، اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں (ابراہیم ۳۷-۳۵)

حضرت ابراہیم کے زمانہ میں شرک کا غلبہ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ عالی شان بت خانے ہر طرف قائم تھے۔ انسان کے لئے بظاہر ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ اس سے ہٹ کر سوچ سکے۔ اس وقت اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے ایک چٹیل زمین میں ایک نئی نسل پیدا کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ ایک محفوظ علاقہ میں ایسے افراد تیار کرنے کا منصوبہ تھا جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر حقائق کا پرستار بن سکے۔ چنانچہ اسی انسانی مادہ سے وہ قوم بنی جس کے متعلق قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں:

ولكن الله حبب اليكم الايمان و زينه في قلوبكم	مگر اللہ نے ایمان کو تمھارے لئے محبوب بنا دیا اور اس
وكره اليكم الكفر والفسوق والعصيان	کو تمھارے دلوں میں مزین کر دیا اور تمھارے لئے کفر

اور فسق اور نافرمانی کو قابل نفرت بنا دیا۔ یہی لوگ راہ راست والے ہیں۔ اولئک ھم الراشدون (الحجرات ۷)

اس آیت کو ہم اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب کہ اس کو ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے حالات میں رکھ کر دیکھیں جب کہ اصحاب رسول کے ایمان کا واقعہ پیش آیا۔ انھوں نے دکھائی دینے والے خداؤں کے ہجوم میں دکھائی نہ دینے والے خدا کو پایا اور اس کو اپنا سب کچھ بنا لیا۔ عظمت کے مناروں کے درمیان انھوں نے عظمتوں سے خالی پیغمبر کو پہچانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ ایک دین غریب (اجنبی دین) اپنی ساری بے سرو سامانی کے باوجود ان کی نظر میں اتنا محبوب ہو گیا کہ اس کی خاطر کوئی بھی قربانی کرنا ان کے لیے مشکل نہ رہا۔ خلاصہ یہ کہ انھوں نے ایک ایسی سچائی کو دیکھ لیا جو ابھی مجرد روپ میں تھی۔ جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں۔ جو ابھی قومی فخر کا نشان نہیں بنا تھا۔ جس میں اپنا سب کچھ دے دینا تھا۔ مگر دنیا میں اس کے بدلے کچھ بھی پانا نہ تھا۔

اس معاملہ کی ایک نمائندہ مثال وہ ہے جو ہجرت سے پہلے بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت پیش آئی۔ عین اس زمانہ میں جب کہ مکہ میں اسلام کے حالات بے حد تنگ ہو چکے تھے، مدینہ میں کچھ مسلمانوں کی تبلیغ سے اسلام پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ ہر گھر میں داخل ہو گیا۔ اس وقت مدینہ کے کچھ لوگوں نے طے کیا کہ وہ مکہ جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر نصرت کی بیعت کریں اور آپ کو مکہ چھوڑ کر مدینہ آنے کی دعوت دیں۔ حضرت جابر انصاری کہتے ہیں کہ جب مدینہ کے گھر گھر میں اسلام پہنچ گیا تو ہم نے مشورہ کیا کہ آخر کب تک ہم اللہ کے رسول کو اس حال میں چھوڑے رکھیں کہ آپ مکہ کے پہاڑوں میں پریشان اور ڈرے سہمے پھرتے رہیں (ثم ائتمروا جمیعا فقلنا حتی متی نترک رسول اللہ یطوف ویطرد فی جبال مکۃ ویخاف) رسول اللہ کا بے یار و مددگار ہونا ظاہر بینوں کے لئے اس بات کا ثبوت تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہی نہیں۔ اگر اللہ کے رسول ہوتے تو آپ کی یہ حالت کیوں ہوتی۔ مگر اہل مدینہ نے آپ کے معاملہ کو حقیقت کی نظر سے دیکھا۔ انھوں نے یہ راز پا لیا کہ آپ کا معاملہ ایک خدائی معاملہ ہے اور آپ کی مدد کر کے وہ خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مستحق بن سکتے ہیں۔

بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر مدینہ کے ستر سے کچھ اوپر نمائندوں نے مکہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ یہ بیعت کیسے نازک حالات میں ہوئی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس وفد کے ایک رکن کعب بن مالک انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ سے مکہ کے لئے اس طرح روانہ ہوئے کہ ہمارا قبیلہ جو حسب معمول زیارت کعبہ کے لئے جا رہا تھا اس کے ساتھ خاموشی سے حج کے نام پر شریک ہو گئے۔ مکہ کے قریب قبیلہ والوں نے پڑاؤ ڈالا۔ رات کے وقت ہم دوسروں کی طرح ان کے ساتھ سو گئے۔ یہاں تک کہ جب رات کا تہائی

حصہ گزر گیا تو ہم رسول اللہ کی قرارداد کے مطابق اپنے بستروں سے خاموشی کے ساتھ اٹھے، اور مقام موعود کی طرف اس طرح چلے جیسے چڑیا جھاڑیوں میں آہستہ آہستہ چھپتی ہوئی چلتی ہے (نتسلل تسلل القطا مستخفین، سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۴۹)

وہ لمحہ بھی کیسا عجیب تھا جب کہ ایک دنیا پیغمبر کو رد کر چکی تھی، اس وقت کچھ لوگ اس کو قبول کرنے کے لئے سبقت کر رہے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ پیغمبر سے ان کا وطن چھینا جا چکا تھا۔ طائف سے انھیں پتھر مار کر بھگا دیا گیا تھا۔ تمام قبائل نے آپ کو پناہ میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ایسے نازک وقت میں مدینہ کے لوگوں نے آپ کی صداقت کو پہچانا اور آپ کی پکار پر لبیک کہا۔ اس وقت جب کہ انصار مدینہ بیعت کے لئے بڑھے، ایک شخص نے اٹھ کر کہا، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس چیز پر بیعت کر رہے ہو۔ یہ اپنے اموال اور اپنی اولاد کو ہلاک کرنے پر بیعت کرنا ہے۔ انھوں نے کہا ہاں۔ ہم علیٰ نهكة الاموال والاولاد بیعت کر رہے ہیں پھر انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم نے اس عہد بیعت کو آخر تک پورا کر دیا تو ہمارے لئے کیا ہے۔ آپ نے فرمایا جنت۔ انھوں نے کہا، اپنا ہاتھ لائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں ——

اپنے آپ کو اس طرح ایک متنازعہ صداقت کے حوالے کرنا، اپنا سب کچھ اس طرح ایک غیر قائم شدہ حق کو سونپ دینا اتنا انوکھا واقعہ ہے کہ وہ اجتماعی سطح پر تاریخ میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔

غیر متعلق مسائل سے تعرض نہ کرنا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف لائے تو عرب میں وہ تمام مسائل پوری طرح موجود تھے جن کو موجودہ زمانہ میں قومی مسائل کہا جاتا ہے اور جن مسائل کے نام پر عام طور پر دنیا میں تحریکیں اٹھتی ہیں۔ یہ مسائل ذہین افراد کو متاثر کرتے ہیں اور وہ ان کا نعرہ لے کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ تمام مسائل موجود تھے لیکن آپ نے ان سے متعلق تعرض نہیں کیا۔ اگر آپ ان مسائل میں الجھتے تو یہ خدا کے منصوبہ میں اپنے کو شامل کرنا نہ ہوتا۔ وہ سارے مواقع جو ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں پیدا کئے گئے تھے برباد ہو کر رہ جاتے۔

۱۔ حبش نے ۵۲۵ء میں عرب کے سرحدی علاقہ یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ ابرہہ اس زمانہ میں شاہ حبش کی طرف سے یمن کا گورنر تھا۔ ابرہہ کے حوصلے اتنے بڑھے ہوئے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے سال (۵۷۰ء) میں اس نے ہاتھیوں کی فوج سے مکہ پر حملہ کیا تاکہ کعبہ کو ڈھا دے اور مکہ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دے۔ ۵۰ سالہ قبضہ کے بعد یمن پر حبش کی حکومت ختم ہوئی اور اس پر شاہ فارس کی حکومت

قائم ہوگئی جس کی طرف سے باذان یمن کا گورنر مقرر ہوا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اور اس کی خبر کسریٰ (شاہ فارس) کو پہنچی تو اس نے باذان کو لکھا کہ اس آدمی کے پاس جاؤ جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس سے کہو کہ وہ اس دعوی سے باز آئے۔ اگر وہ باز نہ آئے تو اس کا سر کاٹ کر میرے پاس بھیجو (والا فابعث الی براسه، سیرۃ ابن ہشام)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب عرب میں ظاہر ہوئے تو اس وقت عرب کی سرحدوں پر غیر ملکی قبضہ نے کیسے سنگین مسائل پیدا کر رکھے تھے۔ ان حالات میں ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ہم قوموں کو غیر ملکی قبضہ کے خلاف اکساتے اور اس کے خلاف جنگ چھیڑ دیتے۔ اگر آپ ایسا کرتے تو یہ خدا کے منصوبے سے انحراف کے ہم معنی ہوتا۔ کیونکہ خدا کا منصوبہ تو یہ تھا کہ لوگوں سے غیر متعلق امور پر ٹکراؤ نہ کیا جائے بلکہ خاموشی سے دعوت الی اللہ کا کام جاری رکھا جائے۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور تاریخ نے دیکھا کہ بالآخر خود باذان نے اسلام قبول کر لیا اور یمن کے عیسائی باشندوں کی اکثریت نے بھی ——— جو مقصد ایک قومی لیڈر ناکام طور پر سیاسی کارروائیوں کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا وہ آپ نے کامیاب طور پر دعوتی کارروائی کے ذریعہ حاصل کر لیا۔

۲۔ ابوطالب کی وفات کے بعد قبائلی رسم کے مطابق بنو ہاشم کا سردار ابولہب مقرر ہوا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حمایت میں لینے سے انکار کر دیا۔ اب آپ کو کسی دوسرے حمایتی قبیلہ کی ضرورت پیش آئی۔ آپ حمایتی کی تلاش میں مختلف قبائل کے پاس گئے۔ عرب کا ایک سرحدی قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ تھا۔ آپ اس سے ملے تو قبیلہ کے سردار مثنیٰ بن حارثہ نے کہا کہ ہم کسریٰ (شاہ فارس) کی مملکت کے قریب رہتے ہیں۔ وہاں ہم ایک معاہدہ کے تحت مقیم ہیں جو کسریٰ نے ہم سے لیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کوئی نئی بات نہ کریں گے اور نہ کسی نئی بات کرنے والے کو پناہ دیں گے۔ اور شاید بادشاہوں کو وہ بات ناپسند ہو جس کی طرف آپ بلاتے ہیں (ان لا نحدث حدثا ولا نؤوی محدثا۔ ولعل هذا الامر الذی تدعوا الیه تکرهه الملوک، سیرۃ ابن کثیر)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اطراف عرب میں بیرونی سلطنتوں کے نفوذ نے جو مسائل پیدا کئے تھے وہ صرف سیاسی یا ملکی ہی نہ تھے بلکہ دعوت و تبلیغ کے معاملہ تک بھی پہنچ گئے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہ کہہ کر پہلے مرحلہ ہی میں ان سے لڑائی چھیڑ دیں کہ جب تک یہ خارجی رکاوٹیں دور نہ ہوں کوئی دعوتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اول مرحلہ میں ان خارجی طاقتوں سے لڑ جاتے تو یہ خدائی منصوبہ کے خلاف ہوتا۔ کیونکہ خدائی منصوبہ تو یہ تھا کہ روم و فارس کو آپس میں بیس سال تک لڑا کر بالکل کمزور کر دیا

جائے اور پھر خود انھیں پر جارحیت کا الزام ڈال کر مسلمانوں کے لئے ان کو فتح کرنا آسان بنا دیا جائے۔ اگر مسلمان ابتدائی مرحلہ میں روم و فارس سے لڑ جاتے تو وہ نتیجہ بالکل برعکس صورت میں نکلتا جو بعد کے تصادم کے ذریعہ حیرت انگیز غیر ملکی فتوحات کی صورت میں برآمد ہوا۔

خدائی منصوبہ سے مطابقت

کسان کا معاملہ قدرت کے کاگ (دندانہ) میں اپنا کاگ دینے کا معاملہ ہے۔ خدا نے ہماری زمین پر فصل اگانے کے بہترین امکانات پیدا کئے ہیں۔ مگر ان امکانات کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کے لئے کسان کو ایک حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین کی سطح پر زرخیز مٹی (Soil) کی تہ رکھی گئی ہے جو معلوم کائنات میں کسی بھی دوسرے مقام پر نہیں۔ مگر تمام زرخیزی کے باوجود اس مٹی سے فصل اسی وقت اگتی ہے جب کہ اس میں نمی بھی ہو۔ اس نمی کے نہ ہونے کی وجہ سے خشک علاقوں کے صحرا چٹیل بیابان بن کر رہ گئے ہیں، اس حقیقت کو قدرت لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کر کے نہیں بتاتی بلکہ خاموش اشارہ کی زبان میں بتاتی ہے۔ کسان کو اسے خاموش اشارہ کی زبان میں جاننا پڑتا ہے۔ چنانچہ کسان یہ کرتا ہے کہ وہ یا تو بارش سے نم ہونے والی زمین میں اپنی فصل بوتا ہے یا آب پاشی کے ذریعہ پہلے اس میں نمی پہنچاتا ہے، پھر اپنا دانہ اس میں ڈالتا ہے۔ یہی معاملہ داعی کا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عرب میں اگرچہ بہترین حالات پیدا کر دئے گئے تھے اس کے باوجود ضروری تھا کہ آپ ربانی حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے کام کو آگے بڑھائیں۔ اگر آپ کا منصوبہ خدائی منصوبہ کی رعایت کے بغیر چلتا تو آپ کو بھی وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو عملاً آپ کو حاصل ہوئی۔

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ دعوتی عمل میں ساری اہمیت مسئلہ آخرت کو دی جائے۔ مسئلہ دنیا کو کسی بھی حال میں دعوت کا اشو نہ بنایا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہی مسئلہ انسان کا ابدی اور حقیقی مسئلہ ہے۔ دوسرے تمام مسائل وقتی اور اضافی مسئلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آخرت کے بغیر انسان کی کامیابی بھی اتنی ہی بے معنی ہے جتنی کہ اس کی ناکامی بے معنی۔

دوسری بات یہ کہ انسانی زندگی میں ہر قسم کی کامیابی کا تعلق افراد کے کردار سے ہے۔ اور انسان کے اندر حقیقی اور مستقل کردار صرف آخرت پر گہرے یقین ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ انسان آزاد اور خود مختار نہیں ہے، بلکہ وہ ہر آن خدا کی پکڑ میں ہے۔ یہ عقیدہ آدمی سے بے راہ روی کا مزاج چھین لیتا ہے اور اس کو پابند اور ذمہ دار انسان بنا دیتا ہے —— قرآن و حدیث کو اگر خالی الذہن ہو کر پڑھا جائے تو اس میں آخرت کا مسئلہ سب سے زیادہ ابھرا ہوا مسئلہ نظر آئے گا۔ دوسرے مسئلوں کا ذکر بھی اگرچہ آتا ہے مگر وہ ضمناً ہے نہ کہ اصلاً۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ داعی اور مدعو کے درمیان کسی بھی حال میں کوئی مادی جھگڑا نہ کھڑا کیا جائے۔ مدعو کو کسی بھی حال میں فریق نہ بننے دیا جائے، خواہ اس کی جو بھی قیمت دینی پڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس حکمت کی ایک نمایاں مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ قریش نے مسلمانوں کے خلاف جنگ چھیڑ کر یہ صورت حال پیدا کر دی تھی کہ مسلم گروہ اور غیر مسلم گروہ دونوں ایک دوسرے کے جنگی فریق بن گئے تھے۔ تمام وقت جنگ کی باتوں اور جنگ کی تیاریوں میں گزرنے لگا تھا۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے ہر مطالبہ کو مانتے ہوئے ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا۔ یہ معاہدہ اس قدر یک طرفہ تھا کہ بہت سے مسلمانوں نے اس کو ذلت کا معاہدہ سمجھا، مگر خدا کے نزدیک وہ فتح مبین (الفتح ۱) کا دروازہ تھا۔ کیونکہ اس کے ذریعہ جنگی مقابلہ آرائی کی فضا ختم ہوتی تھی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ بحال ہو رہا تھا۔ چنانچہ اس معاہدہ کے بعد جیسے ہی اہل عرب جنگی فریق کے بجائے مدعو کے مقام پر آئے، ان کے درمیان دعوت حق کی آواز پھیلنے لگی۔ یہاں تک کہ صرف دو سال میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً دس گنا بڑھ گئی۔ جو مکہ جنگ سے فتح ہوتا نظر نہ آتا تھا وہ دعوتی عمل کے ذریعہ مسخر ہو گیا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ مدعو پر قابو پانے کے باوجود اس کے ساتھ فراخی کا سلوک کیا جائے۔ اس معاملہ کی مثالیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ فتح مکہ کے بعد قریش کے تمام وہ لوگ پوری طرح آپ کے قابو میں تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ اور مسلمانوں کے ساتھ بدترین ظلم کئے تھے۔ مگر آپ نے ماضی کے جرائم کی بنیاد پر کسی کو سزا نہ دی۔ سب کو یک طرفہ طور پر معاف کر دیا۔ قریش کے لوگ جب بندھے ہوئے آپ کے سامنے حاضر کئے گئے تو آپ نے فرمایا: اذھبوا فانتم الطلقاء (جاؤ تم سب آزاد ہو) کچھ لوگوں کے بارے میں آپ نے وقتی طور پر قتل کئے جانے کا حکم دے دیا۔ مگر اس کے بعد ان میں سے بھی ہر اس شخص کو معاف کر دیا گیا جب کہ اس نے یا اس کی طرف سے کسی نے آ کر آپ سے جاں بخشی کی درخواست کی۔ اس قسم کے سترہ نامزد آدمیوں میں سے صرف پانچ کو قتل کیا گیا جنھوں نے معافی نہیں مانگی تھی۔ احد کی جنگ میں وحشی بن حرب نے حضرت حمزہ کو قتل کر دیا۔ اس کے بعد ہند بنت عتبہ نے آپ کی لاش کو لے کر اس کا مثلہ کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا تو وقتی طور پر آپ کی زبان سے نکل گیا کہ اگر اللہ نے مجھے ان کے اوپر فتح دی تو میں ان کے تین آدمیوں کا مثلہ کروں گا (لئن اظھرنی اللہ علیہم لا مثلن بثلاثین رجلاً منہم، تفسیر ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۳۵۲) فتح مکہ کے بعد آپ نے جن سترہ آدمیوں کے قتل کا حکم دیا تھا ان میں وحشی اور ہند دونوں شامل تھے۔ مگر دونوں نے جب آپ کی خدمت میں آ کر معافی مانگی تو دونوں کو معاف کر دیا گیا۔ کیونکہ یہی طریقہ منصوبۂ الٰہی کے مطابق تھا۔

یہ اصول بے حد اہم حکمت پر مبنی ہے۔ انسان پتھر نہیں ہے کہ ایک پتھر کو توڑ دیا جائے تو اس کے دوسرے قریبی پتھر توڑنے والے کے بارے میں کوئی ردعمل ظاہر نہ کریں۔ انسان زندہ معاشرہ کا ایک زندہ جزء ہے۔ جب بھی ایک انسان پر جارحانہ کارروائی کی جاتی ہے تو اس کے قریبی لوگوں میں انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اس طرح سماج میں تخریبی کارروائیاں جنم لیتی ہیں۔ فتح کے بعد جو وقت نئی تعمیر میں لگتا وہ تخریب کاروں کا مقابلہ کرنے میں صرف ہونے لگتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد پچھلے مخالفین کو عمومی معافی دے کر آئندہ کے لئے ہر قسم کی تخریبی سرگرمیوں کا دروازہ بند کر دیا۔ مزید یہ کہ ان کی اکثریت اسلام قبول کر کے اسلام کی طاقت کا ذریعہ بن گئی، جیسے کہ عکرمہ ابن ابی جہل۔

۴۔ فتح و غلبہ حاصل کرنے کے بعد اجتماعی معاملات کی اصلاح کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جلد بازی کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر و تدریج کے ذریعہ اصلاحات کا نفاذ کیا۔

مکہ کے قریش دین ابراہیمی کے وارث تھے۔ مگر انھوں نے اصل دین ابراہیمی کو بگاڑ دیا اور اس میں بہت سی بدعتیں جاری کر دیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم نے حج کو قمری مہینوں کی بنیاد پر ذی الحجہ میں قائم کیا تھا۔ قمری سال شمسی سال سے گیارہ دن کم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے قمری مہینوں کی مطابقت موسموں کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ حج کبھی ایک موسم میں آتا اور کبھی دوسرے موسم میں۔ یہ صورت قریش کے تجارتی مفاد کے خلاف تھی۔ انھوں نے حج کو ہمیشہ گرمی کے موسم میں رکھنے کے لئے نسیئ (کبیسہ) کا طریقہ اختیار کر لیا۔ وہ قمری مہینوں میں ہر سال گیارہ دن بڑھا دیتے۔ اس طرح نام اگرچہ قمری مہینوں کا ہوتا مگر عملاً اس کا سال شمسی سال کے ساتھ چلتا۔ اس کی وجہ سے تاریخیں ۳۳ سال تک کے لئے بدل جاتیں، ایک بار مہینوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کے بعد دوبارہ ۳۳ سال پر ایسا ہوتا کہ حج ابراہیمی طریقہ کے مطابق اصل ذی الحجہ میں پڑتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ وہ قریش کی بدعتوں کو ختم کر کے حج کو دوبارہ ابراہیمی طریقہ پر قائم کریں۔ فتح مکہ (رمضان ۸ھ) کے بعد آپ عرب کے حکمراں بن گئے۔ آپ ایسا کر سکتے تھے کہ نسیئ کی بدعت کو فوری طور پر ختم کرنے کا اعلان کر دیں۔ مگر آپ نے صبر سے کام لیا۔ اس وقت نسیئ کے ۳۳ سالہ دور کو پورا ہونے میں صرف دو سال باقی تھے۔ آپ نے دو سال انتظار فرمایا۔ مکہ کے فاتح ہونے کے باوجود دو سال آپ حج کے لئے نہیں گئے۔ آپ نے صرف تیسرے سال (۱۰ھ) حج کی عبادت میں شرکت کی جو کہ ۳۳ سالہ دور کو پورا کر کے ٹھیک ابراہیمی تاریخ پر ذی الحجہ میں ہو رہا تھا۔ اس وقت مشہور حجۃ الوداع میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ اس سال حج جس طرح ہو رہا ہے اسی طرح اب ہر سال ہوگا۔ اب نسیئ کا اصول ہمیشہ کے لئے ختم کیا جاتا ہے۔ یہی بات ہے جو حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپ نے ان الفاظ میں ادا فرمائی:

ایھا الناس ان الزمان قد استدار فھو الیوم کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض، وان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھراً
(ابن جریر وابن مردویہ)

اے لوگو زمانہ گھوم گیا۔ پس آج کے دن وہ اپنی اس ہیئت پر ہے جس دن کہ اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ اور مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک ۱۲ مہینے ہیں۔

اس تاخیر میں بہت گہری مصلحت تھی۔ کیونکہ مذہب میں جب کوئی طریقہ عرصہ تک رائج رہے تو وہ مقدس بن جاتا ہے۔ لوگوں کے لئے اس کے خلاف سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ چونکہ دو سال بعد خود ہی حج ان تاریخوں پر آرہا تھا جو آپ چاہتے تھے۔ اس لئے آپ نے قبل از وقت اقدام کر کے غیر ضروری مسئلہ کھڑا کرنے سے پرہیز کیا۔ جب فطری رفتار سے حج اپنی اصل تاریخ پر آگیا تو آپ نے اعلان فرما دیا کہ یہی حج کی اصل تاریخ ہے اور آئندہ اب انھیں تاریخوں میں حج ہوتا رہے گا۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنی پوری تحریک میں ربانی حکمت کو ملحوظ رکھا۔ آپ نے خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملایا، آپ نے خدائی منصوبہ سے موافقت کرتے ہوئے تمام کارروائیاں کیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی کوششوں کے عظیم الشان نتائج برآمد ہوئے۔

دور جدید میں اسلامی دعوت

دین کی دعوت کو دو بڑے دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور سے پہلے۔ دوسرا، پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کے بعد۔ آپ سے پہلے خدا کی جو کتابیں آئیں ان کی حفاظت کی ذمہ داری خود ان لوگوں پر ڈالی گئی تھی جن کی طرف وہ کتابیں بھیجی گئی تھیں۔ اس لئے ان کے بارے میں استحفاظ (حفاظت طلب کرنا) کا لفظ آیا ہے (بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء، مائدہ ۴۴) مگر قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھ میں لے لی (انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، الحجر ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ شرک کو مغلوب کریں اور توحید کو غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں رائج کر دیں (الانفال ۳۹) یہ کام صرف خدا کی نصرت سے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا کئے جن کو استعمال کر کے آپ نے شرک کو مغلوب کیا اور توحید کو فکری غلبہ کے مقام پر پہنچایا۔

رسول اور اصحاب رسول کی کوششوں کے نتیجہ میں شرک ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گیا۔ اب

اس کی کوئی امید نہیں کہ شرک دوبارہ ایک غالب فکر کی حیثیت سے دنیا میں ابھر سکے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں دوبارہ یہ واقعہ ہوا کہ توحید نے غالب فکر کی حیثیت سے اپنا مقام کھو دیا۔ آج ساری دنیا میں الحاد کو غالب فکر کی حیثیت حاصل ہے۔ بے خدا ذہن یا سکولر طرز فکر آج دنیا کا غالب فکر ہے۔ اس کے مقابلہ میں توحید کا فکر عملاً دوسرے درجہ پر چلا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں کرنے کا اصل کام یہی ہے کہ ملحدانہ طرز فکر کو مغلوب کیا جائے تاکہ توحید اپنا غلبہ کا مقام دوبارہ حاصل کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کو یقیناً معلوم تھا کہ آئندہ دور الحاد آنے والا ہے۔ اس لئے اس کی نصرت دوبارہ متحرک ہوئی۔ پچھلے ہزار سالہ عمل کے دوران اس نے دوبارہ ایسے حالات پیدا کرنے شروع کئے جو بالآخر دعوت توحید کے لئے معاون بن سکیں۔ یہ عمل اب اپنی تکمیل کے مرحلہ میں پہنچ گیا ہے۔ آج اگرچہ بظاہر الحاد کا فکری غلبہ ہے۔ مگر وہ حالات پوری طرح پیدا ہو چکے ہیں جن کو استعمال کر کے دوبارہ توحید کو فکری غلبہ کا مقام دیا جا سکے۔

پہلے مرحلہ میں غلبۂ توحید کا کام دعوت کے بعد طاقت کے ذریعہ انجام پایا (وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة، البقرہ ۱۹۳، بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق، الانبیاء ۱۸) مگر دوسرے مرحلہ میں یہ کام تبیین و تبلیغ کے ذریعہ انجام پاتا ہے، جیسا کہ قرآن کے اشارہ سے معلوم ہوتا ہے:

سنريهم آياتنا في الآفاق وفي انفسهم حتى يتبين لهم انه الحق اولم يكف بربك انه على كل شيئ شهيد (حم سجدہ ۵۳)

ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے دنیا میں بھی اور ان کے اندر بھی، یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ یہ (قرآن) بالکل حق ہے۔ کیا تیرے رب کا ہر بات پر شاہد ہونا کافی نہیں

ذہنی انقلاب

موجودہ زمانہ میں ایک زبردست ذہنی انقلاب آیا ہے۔ یہ انقلاب کیا ہے؟ اس کے لئے کوئی دوسرا موزوں لفظ نہ ہونے کی وجہ سے میں اس کو سائنسی انقلاب کہتا ہوں۔ جدید سائنسی انقلاب نے انسانی تاریخ میں پہلی بار ایسی فکری تبدیلیاں پیدا کی ہیں جو دعوت توحید کے عین موافق ہیں۔ ان کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو صرف قلمی و لسانی تبلیغ کے ذریعہ غلبہ توحید کا وہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے جس کے لئے اس سے پہلے تلوار اٹھانی پڑی تھی۔

جدید سائنسی انقلاب در اصل صدر اول کے اسلامی انقلاب کا ایک ضمنی حاصل (By-product) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسلامی انقلاب کے ذریعہ ایسے اسباب پیدا کئے جنھوں نے تاریخ کے اندر اپنا عمل شروع کیا۔

یہاں تک کہ وہ اس انقلاب تک پہنچا جس کو جدید سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔ گویا خدا نے صدر اول میں شرک کے اوپر توحید کو غلبہ دیا تو اسی کے اندر وہ اسباب بھی پیدا کر دئے جو بعد کے زمانہ میں الحاد پر توحید کو غالب کرنے میں مددگار بن سکیں۔

اسلام کے ذریعہ آنے والے توحیدی انقلاب سے پہلے ساری دنیا میں شرک کا غلبہ تھا۔ شرک دراصل مظاہر پرستی کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی ہر چیز جو نمایاں نظر آئی اسی کو انسان نے پوجنا شروع کر دیا، خواہ وہ آسمان کا سورج ہو یا زمین کا بادشاہ۔ اس کی وجہ سے دور شرک میں سائنسی تحقیق کا کام ممکن نہ ہو سکا۔ آرنلڈ ٹوائن بی کے الفاظ میں، فطرت کے مظاہر اس وقت پرستش کا موضوع (Object of Worship) بنے ہوئے تھے، پھر وہ تحقیق کا موضوع (Object of Investigation) کیسے بنتے۔ اسلام نے شرک کو مغلوب کر کے توحید کو غالب کیا تو ایک خدا کے سوا ہر چیز مخلوق نظر آنے لگی، اس انقلاب نے یہ ممکن بنا دیا کہ چیزوں پر تحقیق کا عمل جاری کیا جا سکے۔ یہ عمل ابتدائی صورت میں دور اول ہی میں شروع ہو گیا تھا۔ ایک بار چاند گرہن کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سورج گرہن اور چاند گرہن اللہ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ وہ کسی بڑے آدمی کی پیدائش یا موت کی بنا پر نہیں ہوتے۔ اس طرح آپ نے مادی بڑائی کی بھی نفی کر دی اور انسانی بڑائی کی بھی۔ یہ فکری لہر عقیدہ سے الگ ہو کر یورپ پہنچی اور بالآخر جدید انقلاب کا سبب بنی۔

۱۔ اس انقلاب کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ توہماتی دور کا خاتمہ ہو گیا۔ توہم پرستی کیا ہے۔ توہم پرستی نام ہے حقائق کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کے بجائے مفروضات وقیاسات کی بنیاد پر رائے قائم کرنے کا۔ (مثلاً یہ فرض کر لینا کہ جب کسی بڑے آدمی کی موت ہوتی ہے تو سورج یا چاند گہنا جاتے ہیں) یہ ذہن اسلام کی طرف بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایسا آدمی حقائق واقعی کی بنیاد پر اسلام اور غیر اسلام کا جائزہ نہیں لیتا بلکہ پیشگی مفروضات کی بنیاد پر بلا دلیل ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط مان لیتا ہے۔ مثلاً اسلام تاریخی طور پر ایک مستند دین ہے اور دیگر تمام مذاہب تاریخی استناد سے محروم ہیں۔ مگر توہمات کے دور میں انسان اس کو اہمیت نہیں دے پاتا تھا۔ جدید دور نے اس کو پوری اہمیت کے ساتھ لیا۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں تنقید عالیہ (Higher Criticism) کے نام سے ایک مستقل فن وجود میں آگیا ہے۔ اس فن کے تحت یہ حقیقت پوری طرح مسلّم ہو گئی ہے کہ تاریخی طور پر معتبر دین صرف اسلام ہے۔ دوسرے ادیان کو تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل نہیں۔

۲۔ سائنسی ذہن نے کائنات کو تجربہ اور مشاہدہ کی روشنی میں جاننے کی کوشش کی۔ اس کے

نتیجہ میں کائنات میں چھپے ہوئے ایسے فطری حقائق انسان کے علم میں آئے جو اسلام کی تعلیمات کی تصدیق اعلیٰ سطح پر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انسان کی تحقیق نے بتایا کہ کائنات میں ہر جگہ ایک ہی قانون فطرت کارفرما ہے۔ جو قانون زمین کے احوال پر حکمراں ہے وہی قانون کائنات کے دور دراز مقامات پر بھی حکمراں ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا خدا صرف ایک ہے۔ دو خدا یا بہت سے خداؤں کی اس کائنات میں گنجائش نہیں۔

۳۔ دین توحید کو قدیم زمانہ میں اختیار کرنے کے لئے، ایک علمی رکاوٹ، قدیم فلسفہ بھی تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ کو غالب علم کا مقام حاصل تھا۔ تعلیم یافتہ طبقہ کے سوچنے کی ذہنی زمین اس زمانہ میں فلسفہ ہوتا تھا۔ اس کے نتیجہ میں دین توحید کی راہ میں ایک بہت بڑی مصنوعی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔

قدیم فلسفہ کا آخری نشانہ ہمیشہ سے آخری سچائی کی تلاش رہا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ تقریباً پانچ ہزار سال کی شان دار تاریخ کے باوجود فلسفہ اپنے نشانہ تک پہنچنے میں مکمل طور پر ناکام رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ فلسفہ انسان کی محدودیتوں (Limitations) کا ادراک نہ کر سکا۔ وہ آخری سچائی تک پہنچنے کے لئے ساری کوششیں صرف کرتا رہا۔ جب کہ انسان اپنی محدود صلاحیتوں کی وجہ سے بطور خود آخری سچائی تک پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔

اس فلسفیانہ طرز فکر کی وجہ سے ہزاروں برس تک انسان یہ چاہتا رہا کہ دین توحید کی بنیاد جن اساسی عقائد پر قائم ہے اس کو انسان کے لئے مکمل طور پر معلوم اور مشاہد بنا دیا جائے۔ مگر یہ تمام غیبی حقیقتیں تھیں اور انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ ان غیبی حقیقتوں کا کامل ادراک نہیں کر سکتا۔

جدید سائنس کا، دینی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اس نے آخری طور پر یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی صلاحیتیں محدود ہیں۔ وہ اپنی محدودیت کی وجہ سے حقیقت کا کلی ادراک نہیں کر سکتا۔ قدیم فلسفہ کی پیدا کردہ ذہنی زمین اب ساری دنیا میں دفاعی حیثیت کے مقام پر جا چکی ہے اور اب سائنس کی دریافت کردہ ذہنی زمین کو علمی دنیا میں غالب مقام حاصل ہے۔

ذہن کی اس تبدیلی نے دین توحید کے لئے راستہ صاف کر دیا ہے۔ اب اس نقطۂ نظر کو، کم از کم بالواسطہ طور پر، مکمل علمی تائید حاصل ہے کہ انسان کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ حقیقت اعلیٰ کو پانے کے لئے وہ پیغمبر کی اطلاع کا اعتبار کرے۔ اب یہ مطالبہ سراسر غیر علمی مطالبہ بن چکا ہے کہ خدا اور وحی اور آخرت کو ہماری آنکھوں سے ہمیں دکھاؤ، اس کے بعد ہی ہم اس پر ایمان لائیں گے۔

معلوم تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ خود علم انسانی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان کا علم محدود ہے

اور ہمیشہ محدود رہے گا۔ انسان سائنسی ذرائع سے جب کائنات کی کھوج کرتا ہے تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ کائنات اس سے زیادہ پیچیدہ ہے کہ انسان کا محدود ذہن اس کا احاطہ کرسکے۔ سائنس کی یہ دریافت اسلامی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے۔ کیونکہ اس سے رسالت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک طرف انسان کا یہ حال ہے کہ وہ حقیقت کو آخری حد تک جان لینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف انسان اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ایسی محدودیت کا شکار ہے کہ وہ کبھی بھی حقیقت کو آخری حد تک نہیں جان سکتا۔ انسانی زندگی کا یہ خلا واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس کو ایک برتر رہنما کی ضرورت ہے۔ اسی برتر رہنما کا دوسرا نام پیغمبر ہے۔ انسانی محدودیت کے بارے میں سائنس کے اقرار نے پیغمبر کی ضرورت کو خالص علمی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔

۴۔ قدیم زمانہ میں انسان کو اظہار رائے کی آزادی حاصل نہ تھی۔ اس کی اصل وجہ بادشاہوں اور بڑے انسانوں کے تقدس کا عقیدہ تھا۔ جو لوگ کسی وجہ سے اونچے مقام پر پہنچ جاتے ان کو مقدس سمجھ لیا جاتا۔ ان کی رائے دوسروں سے برتر مانی جاتی۔ ان کو یہ حق مل جاتا کہ جس طرح چاہیں دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند بنائیں۔ توحید کے انقلاب نے انسانی بڑائی کا خاتمہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں۔ اس کے بعد تاریخ میں ایک نئی فکری لہر چل پڑی۔ یہی وہ فکری لہر ہے جس کی سیاسی تکمیل بالآخر یورپ میں جمہوریت کی صورت میں ہوئی۔ جمہوری انقلاب نے تمام انسانوں کو برابر ٹھہرا دیا۔ ہر شخص کے لئے یہ فکری حق تسلیم کر لیا گیا کہ وہ اپنے ضمیر کے مطابق جو چاہے لکھے اور جو چاہے بولے۔ اس انقلاب نے تاریخ میں پہلی بار اس بات کو ممکن بنا دیا کہ خدا کے دین کی تبلیغ اس طرح کی جائے کہ تبلیغ کرنے والے کے لئے کسی طرح کی پکڑ دھکڑ کا اندیشہ نہ ہو۔

۵۔ سائنس نے آج کے انسان کے لئے خدا کی بہت سی وہ مادی نعمتیں کھولی ہیں جو ہزاروں برس سے کائنات کے اندر چھپی ہوئی تھیں۔ ان میں اسلامی دعوت کے نقطۂ نظر سے سب سے اہم جدید ذرائع مواصلات ہیں۔ پریس، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اسی طرح مختلف قسم کی تیز رفتار سواریاں۔ یہ چیزیں اسلام کے حق میں عظیم نعمتیں ہیں۔ ان کو استعمال کر کے اسلامی دعوت کو عالمی سطح پر پھیلایا جاسکتا ہے۔

یہ مواقع جو عملاً اسلامی دعوت کے حق میں ہیں، پچھلے ہزار سالہ عمل کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ پچھلے زمانہ میں جس طرح اللہ تعالیٰ نے ڈھائی ہزار سالہ عمل کے ذریعہ اسلام کے غلبۂ اول کے حالات فراہم کئے، اسی طرح اس نے دوبارہ ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں اسلام کے غلبۂ ثانی کے حالات فراہم کر دئے ہیں۔ تاہم یہ حالات و مواقع خود اپنے زور پر واقعہ نہیں بن جائیں گے۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے زندہ

انسانوں کی ایک جماعت درکار ہے۔ ایسی ایک جماعت اگر کھڑی ہو جائے تو قریبی مستقبل میں اسی طرح دوبارہ اسلام کو فکری غلبہ مل سکتا ہے جس طرح قرن اول میں اس کو شرک کے مقابلہ میں فکری غلبہ حاصل ہوا تھا۔

اوپر جن امکانات کا ذکر ہوا وہ تقریباً ایک سو سال سے ایسی کسی جماعت کا انتظار کر رہے ہیں مگر بدقسمتی سے ایسی کوئی جماعت ابھی تک کھڑی نہ ہو سکی۔ اس میں شک نہیں کہ پچھلے سو سال کے اندر ہمارے یہاں بے شمار جماعتیں اور تحریکیں اٹھی ہیں، مگر یہ تحریکیں وقتی حالات، خصوصاً سیاسی حالات کے رد عمل کے طور پر اٹھیں نہ کہ اس ربانی شعور کے تحت جو پچھلے ہزار سال سے تاریخ کے اندر کام کرتا رہا ہے اور چودھویں صدی ہجری میں اپنی تکمیل کو پہنچا ہے۔

سیرت کی کتابوں میں آتا ہے کہ بدر کے میدان میں جب طاقت ور اہل کفر بظاہر کمزور اہل ایمان کے اوپر ٹوٹ پڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدت احساس کے تحت سجدے میں گر گئے اور اللہ تعالی سے نصرت کی دعائیں مانگنے لگے۔ اس نازک لمحہ میں آپ کی زبان سے جو کلمات نکلے ان میں سے ایک جملہ یہ تھا: اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لا تعبد بعد ھا فی الارض (خدایا اگر یہ گروہ ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی)۔ یہ کوئی مبالغہ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تین سو تیرہ روحیں جو بے سرو سامانی کے باوجود بدر کے معرکہ میں کھڑی ہوئی تھیں یہ محض عام قسم کے تین سو تیرہ لوگ نہ تھے۔ یہ عصابہ دراصل وہ گروہ تھا جس پر ڈھائی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی تھی۔ اسی طرح آج دوبارہ ایک نیا عصابہ (گروہ) درکار ہے جس پر پچھلی ہزار سالہ تاریخ منتہی ہوئی ہو۔ جو اپنے شعور کے اعتبار سے پچھلی ہزار سالہ تاریخ کا وارث ہو۔ جو اپنے کردار کے اعتبار سے ان امکانات کو واقعہ بنانے کا اٹل ارادہ اپنے اندر لئے ہوئے ہو، جو سنجیدہ فیصلے کی اس حد پر پہنچا ہوا ہو جہاں پہنچ کر آدمی اس قابل ہو جاتا کہ وہ اپنے مقصد سے پوری طرح وابستہ رہے۔ کوئی بھی خارجی واقعہ اس کو اس کے نشانہ سے ہٹانے والا ثابت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جو خدا کے کاگ میں اپنا کاگ ملائیں گے۔ اور بالآخر یقینی کامیابی کی منزل تک پہنچیں گے

اصحاب رسول

قرآن میں لوگوں کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے :

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق (البقرہ ۱۳۷)	اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بے شک وہ ہدایت یاب ہوئے اور اگر وہ منھ موڑیں تو وہ اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اصحاب رسول نہ صرف اول الایمان ہیں بلکہ وہی ہمیشہ کے لئے حق کا نمونہ بھی ہیں ۔ خدا کے یہاں جو ایمان معتبر ہے وہ وہی ایمان ہے جو صحابہ کرام جیسا ایمان ہو ۔ دین وایمان کی کوئی ایسی قسم جو صحابۂ کرام کے دین وایمان سے مختلف ہو، اللہ تعالیٰ کو مطلوب نہیں ۔

یہاں صحابۂ کرام کی چند خصوصیات مختصراً درج کی جاتی ہیں

دین ان کے لئے محبوب چیز بن گیا تھا

اصحاب رسول کی خصوصیت قرآن میں یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان ان کے لئے ایک محبوب شئے بن گیا تھا (الحجرات ۷) محبت کسی چیز سے تعلق کا آخری درجہ ہے ۔ اور جب کسی چیز سے محبت کے درجہ کا تعلق پیدا ہو جائے تو وہ آدمی کے لئے ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے ۔ اس کے بعد آدمی کا ذہن اس چیز کے بارے میں اس طرح متحرک ہو جاتا ہے کہ آدمی بغیر بتائے ہوئے اس سے متعلق ہر بات کو جان لیتا ہے ۔ اس کو خواہ معروف معنوں میں کوئی نقشہ کار نہ دیا گیا ہو مگر اس کا ذہن خود بتا دیتا ہے کہ اس کو اپنی محبوب شے کے لئے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے (التوبہ ۴۶)

محبت کی سطح کے تعلق کا مطلب ہے دل چسپی کی سطح کا تعلق ۔ یعنی یہ کہ آدمی اسلام کے نفع نقصان کو خود اپنا نفع نقصان سمجھنے لگے ۔ اصحاب رسول کو اسلام سے اسی قسم کا تعلق پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ اسلام کے فائدے سے اسی طرح خوش ہوتے تھے جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے کی کامیابی سے خوش ہوتا ہے ۔ اسلام کو کوئی نقصان پہنچے تو وہ اسی طرح بے چین ہو جاتے تھے جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے کے متعلق ناخوش گوار خبر سن کر تڑپ اٹھتا ہے اور اس وقت تک اسے چین نہیں آتا جب تک وہ اس کی تلافی نہ کر لے ۔

کسی چیز سے محبت کے درجے کا تعلق پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن اس کے بارے میں پوری طرح

جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی دینے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کی ضرورت اور تقاضوں کو وہ بتائے بغیر جان لیتا ہے۔ اس کی بات کو پانے کے لئے کوئی نفسیاتی گرہ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے راستے میں اپنا حصہ ادا کرنے کے لئے وہ کسی چیز کو عذر نہیں بناتا۔

جب آدمی کسی معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھ لے تو اس کے بعد اس کو نہ زیادہ بتانے کی ضرورت ہوتی اور نہ زیادہ سمجھانے کی۔ اس کا قلبی تعلق اس کے لئے ہر دوسری چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ وہ کسی معاوضہ کی امید کے بغیر یک طرفہ طور پر اپنا سب کچھ اس کے لئے لٹا دیتا ہے۔ اس کی خاطر کھونا بھی اس کو پانا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خاطر بے قیمت ہو جانا اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر دوسری مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے لئے وہ ہر تکلیف کو اس طرح سہہ لیتا ہے جیسے کہ وہ کوئی تکلیف ہی نہ ہو۔

اصحاب رسول کوئی غیر معمولی انسان نہ تھے۔ وہ کوئی ماورائے بشر مخلوق نہیں تھے۔ ان کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ "محبت" کے درجہ کا تعلق جو عام انسانوں کو صرف اپنے آپ سے ہوتا ہے وہی تعلق ان کو دین و ایمان سے ہو گیا تھا۔ عام آدمی اپنے مستقبل کی تعمیر کو جو اہمیت دیتا ہے وہی اہمیت وہ اسلام کے مستقبل کی تعمیر کو دینے لگے تھے۔ وہ دین کے لئے اپنا حصہ ادا کرنے کو اتنا ہی ضروری سمجھنے لگے تھے جتنا کوئی شخص اپنی ذاتی دلچسپی کے معاملہ میں اپنے آپ کو اور اپنے اثاثہ کو استعمال کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ ان کی یہی خصوصیت تھی کہ وہ تاریخ کے وہ گروہ بنے جس نے اسلام کو عظیم ترین کامیابی کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبر کو آغاز تاریخ میں پہچاننا

صحابہ کی یہ انوکھی صفت تھی کہ انھوں نے اپنے ایک معاصر رسول کو پہچانا اور اس کا ساتھ دیا۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ معلوم تاریخ میں جماعت کی سطح پر صرف ایک بار پیش آیا ہے۔ قدیم تاریخ کے ہر دور میں یہ قصہ پیش آیا کہ رسولوں کے مخاطبین نے ان کا انکار کیا اور ان کا مذاق اڑایا۔ بائبل میں ہے کہ "تم نے میرے نبیوں کو ناچیز جانا" یہ نبیوں کو ناچیز جاننے والے کون لوگ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو وحی و رسالت کو مانتے تھے۔ نبیوں کے نام پر ان کے یہاں ادارے قائم تھے اور بڑے بڑے جشن ہوتے تھے۔ مگر یہ سب کچھ قدیم نبیوں کے نام پر ہوتا تھا۔ جہاں تک وقت کے نبی کا سوال تھا، اس کے لئے ان کے پاس استہزاء و تمسخر کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہود نے حضرت مسیح کا انکار کیا، حالانکہ وہ موسیٰ کو مانتے تھے۔ نصاریٰ نے حضرت محمد کا انکار کیا، حالانکہ وہ حضرت مسیح کی پرستش کی حد تک عزت کرتے تھے۔ اسی طرح قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر مارے اور آپ کو گھر سے نکالا، حالانکہ وہ حضرت ابراہیم کے وارث ہونے پر فخر کرتے تھے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم نبی کی نبوت تاریخی روایات کے نتیجہ میں ثابت شدہ نبوت بن جاتی ہے۔ وہ کسی قوم کے قومی اثاثہ کا ایک لازمی جز ہوتی ہے۔ کسی قوم میں آنے والا نبی اس کی بعد کی نسلوں کے لئے ایک طرح کا مقدس ہیرو بن جاتا ہے۔ اس کو ماننا اپنے قومی تشخص کو قائم کرنے کے ہم معنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے نبی کو کون نہیں مانے گا۔ مگر وقت کے نبی کی نبوت ایک متنازعہ نبوت ہوتی ہے۔ وہ التباس کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کو ماننے کے لئے ظواہر کا پردہ پھاڑ کر حقیقت کو دیکھنا پڑتا ہے۔ اس کا ساتھ دینے کے لئے اپنی انا کو دفن کرنا ہوتا ہے۔ اس کے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ایک ایسے مشن کی راہ میں اپنا سرمایہ خرچ کرنا ہوتا ہے جس کا برسرحق ہونا ابھی اختلافی ہو، جس کے بارے میں تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہ ہوئی ہوں۔ صحابہ کرام وہ لوگ تھے جنھوں نے معاصر رسول کو اس طرح مانا جس طرح کوئی شخص تاریخی رسول کو مانتا ہے۔

غزوۂ خندق میں جب محاصرہ شدید ہوا اور معمولی ضروریات کی فراہمی ناممکن ہوگئی تو ایک مسلمان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ محمد ہم سے وعدہ کرتے تھے کہ ہم کسریٰ اور قیصر کے خزانے حاصل کریں گے اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا ایک شخص بیت الخلا جانے کے لئے بھی محفوظ نہیں (کان محمد یعدنا ان ناکل کنوز کسریٰ وقیصر واحدنا لا یامن ان یذھب الی الغائط، سیرۃ ابن ہشام جزء ثانی صفحہ ۲۲۴) غزوۂ خندق کے وقت رسول اللہ کا وعدہ محض ایک لفظی وعدہ تھا، آج یہ ایک تاریخی واقعہ بن چکا ہے۔ صحابہ نے اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے سے پہلے رسول کی عظمت کو مانا۔ ہم آج اس وعدہ کے تاریخی واقعہ بننے کے بعد رسول کی عظمت کو مان رہے ہیں۔ دونوں ماننے میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ ایک کو دوسرے سے کوئی نسبت نہیں۔ آج ایک غیر مسلم محقق بھی پیغمبر اسلام کو تاریخ کا سب سے بڑا انسان کہنے پر مجبور ہے مگر آپ کی زندگی میں آپ کی عظمت کو پہچاننا اتنا مشکل تھا کہ صرف وہی لوگ اس کو پہچان سکتے تھے جن کو خدا کی طرف سے خصوصی توفیق ملی ہو۔

قرآن کو دور نزاع میں اپنانا

سیرت کی کتابوں میں صحابہ کا دعوتی طریقہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ قرآن کے نازل شدہ حصہ کو لے لیتے اور اس کو لوگوں کے سامنے پڑھ کر سناتے تھے (فعرض علیھم الاسلام وتلا علیھم القرآن) چنانچہ مدینہ میں جو صحابہ تبلیغ کے لئے گئے ان کو وہاں مقری (قرآن پڑھنے والا) کہا جاتا تھا۔ یہ بات آج کے ماحول میں بظاہر انوکھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اگر چودہ سو سال کی تاریخ کو حذف کرکے آپ اسلام کے ابتدائی دور میں پہنچ جائیں اور اس وقت کے حالات میں اسے دیکھیں تو یہ اتنا انوکھا واقعہ معلوم ہوگا کہ نہ اس سے پہلے وہ کبھی جماعتی سطح پر پیش آیا اور نہ اس کے بعد۔

آج جب ہم لفظ "قرآن" بولتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی عظیم کتاب کا نام ہوتا ہے جس نے چودہ صدیوں میں اپنی عظمت کو اس طرح مسلم کیا ہے کہ آج کروروں انسان اس کو خدا کی کتاب ماننے پر مجبور ہیں۔ آج اپنے آپ کو قرآن سے منسوب کرنا کسی آدمی کے لئے فخر و اعزاز کی بات بن چکی ہے۔ مگر زمانہ نزول میں لوگوں کے نزدیک اس کی یہ حیثیت نہ تھی۔ عرب میں بہت سے لوگ تھے جو یہ کہتے تھے کہ محمد نے پرانے زمانہ کے قصے کہانیوں کو جوڑ کر ایک کتاب بنالی ہے۔ ہم چاہیں تو ہم بھی ایسی ایک کتاب بنالیں (لو نشاء لقلنا مثل هذا ان هذا الا اساطير الاولين، الانفال ۳۱) کوئی قرآن میں تکرار کو دیکھ کر کہتا کہ یہ کوئی خاص کتاب نہیں۔ محمد کے پاس بس چند باتیں ہیں، انھیں کو وہ صبح شام دہراتے رہتے ہیں (وقالوا اساطير الاولين اكتتبها فهي تملى عليه بكرة واصيلا، الفرقان ۵)

ایسی حالت میں قرآن کو پہچاننا گویا مستقبل میں ظاہر ہونے والے واقعہ کو حال میں دیکھنا تھا۔ یہ ایک چھپی ہوئی حقیقت کو اس کے ثابت شدہ بننے سے پہلے پالینا تھا۔ پھر ایسے وقت میں قرآن کو کتاب دعوت بنالینا اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کیونکہ اس کے لئے اپنی عظمت کو کھوکر دوسرے کی عظمت میں گم ہونا پڑتا ہے۔ یہ اپنے مقابلہ میں دوسری شخصیت کا اعتراف کرنا ہے، اور وہ بھی ایسی شخصیت کا جس کی حیثیت ابھی مسلم نہ ہوئی ہو۔ عرب کے مشہور شاعر لبید نے اسلام قبول کیا اور شاعری چھوڑ دی۔ کسی نے پوچھا کہ تم نے شاعری کیوں چھوڑ دی۔ لبید نے کہا: ابعد القرآن (کیا قرآن کے بعد بھی) آج کوئی آدمی شاعری چھوڑ کر یہ جملہ کہے تو اس کو زبردست عظمت اور مقبولیت حاصل ہوگی۔ مگر لبید کے قول میں اور آج کے شاعر کے قول میں کوئی نسبت نہیں۔ کیونکہ آج کا شاعر تاریخ کے اختتام پر یہ جملہ کہہ رہا ہے جب کہ لبید نے تاریخ کے آغاز پر یہ جملہ کہا تھا۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے۔

لا يستوى منكم من انفق من قبل الفتح وقاتل اولئك اعظم درجة من الذين انفقوا من بعد وقاتلوا الحديد ۱۰

تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا۔ ان کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔

غیر قائم شدہ صداقت کے لئے مال لٹانا

ابن ابی حاتم نے ایک صحابی کا واقعہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

عن عبد الله بن مسعود قال لما نزلت هذه الآية (من ذا الذى يقرض الله قرضا حسنا فيضاعفه

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب قرآن میں یہ آیت اتری کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے

له، الحدید ۱۱) قال ابوالدحداح الانصاری یارسول الله وانّ الله لیرید منا القرض قال نعم یا ابا الدحداح ۔ قال ارنی یدك یارسول الله ۔ قال فناوله یده ۔ قال فانی قد اقرضت ربی حائطی ۔ وله حائط فیه ستمائة نخلة وام الدحداح فیه وعیالها ۔ قال فجاء ابوالدحداح فناداها یا امّ الدحداح قالت لبیك ۔ قال اخرجی فقد اقرضته ربی عزوجل فقالت له ربح بیعك یا ابا الدحداح و نقلت منه متاعها وصبیانها ۔ وانّ رسولَ الله صلی الله علیه قال کم من عذق رداح فی الجنة لابی الدحداح

(تفسیر ابن کثیر)

توحضرت ابودحداح انصاری نے رسول اللہ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: اے خدا کے رسول، کیا اللہ واقعی ہم سے قرض چاہتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اے ابودحداح ۔ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول، اپنا ہاتھ لائیے ۔ راوی کہتے ہیں کہ آپ نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا۔ ابودحداح نے کہا کہ میں نے اپنا باغ اپنے رب کو قرض میں دے دیا۔ ان کا ایک کھجوروں کا باغ تھا جس میں چھ سو درخت تھے ۔ اس وقت ان کی بیوی ام دحداح اپنے بچوں کے ساتھ باغ میں تھیں ۔ وہ باغ میں واپس آئے اور آواز دی کہ اے ام دحداح ۔ انھوں نے کہا ہاں ۔ ابودحداح نے کہا باغ سے نکلو، کیونکہ اس کو میں نے اپنے رب کو قرض میں دے دیا ۔ بیوی نے کہا: اے ابودحداح آپ کی تجارت کامیاب رہی ۔ اور اس کے بعد اپنے سامان اور اپنے بچوں کو لے کر باغ سے نکل آئیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابودحداح کے لئے جنت میں کتنے ہی شاداب اور پھل دار درخت ہیں ۔

یہ ایک نمائندہ واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام جس دین پر ایمان لائے تھے اس دین کی خاطر قربانی پیش کرنے کے لئے وہ کس قدر بے چین رہتے تھے ۔ یہاں دوبارہ ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ واقعہ چودہ سو سال پہلے کا ہے ۔ آج کوئی شخص دین کے نام پر اس قسم کا انفاق کرے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کے درمیان مقبولیت کی صورت میں اس کو بہت جلد اپنے انفاق سے زیادہ بڑی چیز مل جائے ۔ مگر اصحاب رسول کے زمانے میں صورت حال بالکل مختلف تھی ۔ اس وقت دین کی راہ میں اپنا مال لٹانا ماحول میں دیوانگی کا خطاب پانے کا ذریعہ تھا، وہ اونچے میناروں پر نمایاں ہونے کے بجائے بنیاد کی زمین میں دفن ہونے کے ہم معنی تھا ۔ اس وقت ایسا اقدام ایک ایسی تحریک کے خانہ میں لکھا جانے والا تھا جس کی صداقت ابھی مشتبہ تھی جس کی پشت پر تاریخ کی تصدیقات ابھی جمع نہیں ہوئی تھیں ۔ یہ ایک غیر مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرنا تھا، جب کہ آج کا آدمی ایک مسلمہ مد میں اپنا اثاثہ پیش کرتا ہے ۔

اپنا تاج دوسرے کے سر پر رکھنا

مدینہ میں عبداللہ بن ابی بہت عاقل اور صاحب شخصیت آدمی تھا، وہ مدینہ کا سب سے زیادہ ممتاز سردار سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ مدینہ کے باشندوں کو اپنا اختلاف و انتشار ختم کرنے کا احساس ہوا تو انھوں نے عبداللہ بن ابی کو منتخب کیا کہ اس کو اپنا بادشاہ بنائیں اور اس کی علامت کے طور پر اس کو ایک تاج پہنائیں (فاما عبد اللہ بن ابی فکان قومہ قد نظموا لہ الخرز لیتوّجوہ ثم یُملّکوہ علیھم، سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱۶)

عبداللہ بن ابی کی تاج پوشی کا انتظام مکمل ہوچکا تھا کہ عین اس وقت اسلام مدینہ میں پہنچ گیا۔ مدینہ کے باشندوں کی فطرت نے اس کی صداقت کی گواہی دی اور اسلام گھر گھر میں پھیلنے لگا۔ اس کے بعد مدینہ کے باشندوں کا ایک نمائندہ وفد مکہ آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور آپ کی زبان سے آپ کا پیغام سنا۔ انھیں نظر آیا کہ مدینہ کی اجتماعی تنظیم کے لئے انھیں جو شخصیت درکار ہے وہ زیادہ بہتر طور پر محمد بن عبداللہ کی صورت میں موجود ہے۔ انھوں نے مدینہ کے لوگوں کی طرف سے آپ کو پیش کش کی کہ آپ مدینہ آئیں اور وہاں ہمارے سردار بن کر رہیں۔ اسلامی تاریخ کا یہی وہ واقعہ ہے جو بیعت عقبہ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔

یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ یہ اپنا تاج دوسرے آدمی کے سر پر رکھ دینے کے ہم معنی تھا۔ قدیم قبائلی دور میں ایسا کوئی واقعہ بے حد نادر واقعہ تھا۔ اپنی قوم یا قبیلہ سے باہر کسی آدمی کو اپنا غیر مشروط سردار بنا لینا ہمیشہ انسان کے لئے مشکل ترین کام رہا ہے اور قدیم زمانہ میں تو یہ اور بھی زیادہ مشکل تھا۔ مزید یہ کہ جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت "محمد" اس پر عظمت ہستی کا نام نہ تھا جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس وقت محمد ایک ایسے انسان تھے جن کو ان کے اہل وطن نے نکال دیا تھا۔ جن کے ساتھ قومی عصبیت اور تاریخی عظمت شامل نہ ہوئی تھی۔ جو نہ صرف متنازعہ شخصیت تھے بلکہ ایک لٹے ہوئے بے گھر انسان تھے۔ جن کو اپنا سب کچھ دے دینا تھا اور ان سے پانا کچھ بھی نہ تھا ——— بیسویں صدی میں کسی برنارڈ شا کے لئے بہت آسان ہے کہ وہ پیغمبر اسلام کے لئے یورپ کی سرداری کی پیش کش کرے۔ مگر چھٹی صدی عیسوی میں کسی کے لئے اس کا تصور بھی ناممکن تھا کہ وہ آپ کو پیغمبر مان کر آپ کو اپنا اجتماعی امام بنالے۔

اپنی محدودیت کو جاننا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تھا کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آتا تو آپ اس کے بارے میں لوگوں سے مشورہ کرتے۔ آپ اپنے اصحاب کو جمع کرتے اور معاملہ کو بیان کرکے فرماتے کہ اشیروا علی ایھا الناس

(اے لوگو مجھے مشورہ دو) آپ بظاہر سب سے مشورہ طلب کرتے۔ مگر عملاً یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی رہتی اور اس کے بعد حضرت ابوبکر کھڑے ہو کر مختصراً اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصراً کچھ بول کر بیٹھ جاتے۔ اس کے بعد معمولی طور پر کچھ لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ آپ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر کی خلافت کا زمانہ آیا تو آپ بھی اسی طرح لوگوں کو جمع کر کے مشورہ طلب کرتے، اب یہ ہوتا کہ کچھ دیر خاموشی کے بعد حضرت عمر کھڑے ہوتے اور مختصر طور پر اپنی رائے ظاہر کر کے بیٹھ جاتے، اس کے بعد چند لوگ بولتے اور اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔ حضرت عمر کے بعد غیر اصحاب کی تعداد بڑھ گئی اور مذکورہ صورت باقی نہ رہی۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر یہ اتنی اہم بات ہے کہ تاریخ میں کوئی دوسرا معاشرہ نہیں پایا جاتا جس نے اس کا ثبوت دیا ہو۔ یہ طرز عمل صرف اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اتنا خود شناس ہو جائے کہ وہ اپنی کمیوں اور محدودیتوں کو جاننے لگے۔ وہ دوسرے کے "ہے" کے مقابلہ میں اپنے "نہیں" سے واقف ہو جائے۔ وہ اپنے کو اس حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھنے لگے جس نظر سے دوسرا شخص اسے دیکھ رہا ہے۔

اس میں اتنا اور اضافہ کر لیجئے کہ یہ واقعہ جس ابوبکر و عمر کے ساتھ پیش آیا وہ ابوبکر و عمر وہ نہ تھے جن کو آج ہم جانتے ہیں، آج ہم تکمیل تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے ہیں۔ مگر وہ آغاز تاریخ والے ابوبکر و عمر کو جانتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے معاصرین کے لئے صرف ان میں سے ایک تھے۔ جب کہ آج وہ ہمارے لیے گزری ہوئی تاریخ کے ستون ہیں جن کو ہم اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی ثابت شدہ واقعہ کو دیکھتا ہے۔ "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے کے بعد جاننا انتہائی آسان ہے۔ لیکن "ابوبکر و عمر" کو تاریخ بننے سے پہلے جاننا اتنا ہی مشکل ہے۔ اصحاب رسول وہ لوگ تھے جو اس مشکل ترین معیار پر پورے اترے۔

ذمہ داری کو اپنے اوپر لے لینا

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اولاً ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی۔ حضرت عمرو بن العاص نے وہاں پہنچ کر دشمن کی تیاریوں کا حال معلوم کیا تو اپنا دستہ انھیں اس کے لئے ناکافی معلوم ہوا۔ انھوں نے ایک مقام پر ٹھہر کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ موجودہ فوج ناکافی ہے، مزید کمک روانہ کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین میں سے دو سو آدمیوں کا دستہ تیار کیا اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی سرکردگی میں اس کو روانہ فرمایا۔

حضرت ابو عبیدہ جب اپنے دستہ کو لے کر منزل پر پہنچے اور دونوں دستے ساتھ ہو گئے تو یہ سوال پیدا

ہوا کہ دونوں دستوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا کہ دوسرا دستہ میری مدد کے لئے بھیجا گیا ہے اس لئے اصلاً میں ہی دونوں کا امیر ہوں۔ حضرت ابوعبیدہ کے ساتھی اس سے متفق نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یا تو ابوعبیدہ دونوں دستوں کے مشترک امیر ہوں یا دونوں دستوں کا امیر الگ الگ رہے۔ جب اختلاف بڑھا تو ابوعبیدہ بن الجراح نے کہا: اے عمرو، جان لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ آپ نے کہا کہ جب تم اپنے ساتھی سے ملو تو ایک دوسرے کی بات ماننا اور اختلاف نہ کرنا۔ اس لئے خدا کی قسم اگر تم میری نافرمانی کرو گے تب بھی میں تمہاری اطاعت کروں گا (تعلم یا عمرو ان آخر ما عھد الیّ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا۔ وانك واللہ ان عصیتنی لاطعتك، رواہ البیہقی وابن عساکر)

حضرت ابوعبیدہ کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ ذمہ داری کو عمرو بن العاص پر ڈال کر ان سے لامتناہی بحث کرتے رہیں۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ بہت سے ایسے الفاظ پا سکتے تھے جن میں ان کا اپنا وجود بالکل درست اور دوسرے کا وجود بالکل باطل دکھائی دے۔ مگر اس کے بجائے انھوں نے یہ کیا کہ ساری ذمہ داری خود اپنے اوپر لے لی۔ انھوں نے مسئلہ کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیا۔ اجتماعی زندگی میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی اجتماعی زندگی چلتی ہی اس وقت ہے جب کہ اس کے افراد میں اتنی بلندی ہو کہ وہ حقوق کی بحث میں پڑے بغیر اپنے اوپر ذمہ داری لینے کی جرأت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ مزاج نہ ہو وہاں صرف آپس کا اختلاف جنم لیتا ہے نہ کہ آپس کا اتحاد۔

شکایات سے اوپر اٹھ کر سوچنا

خالد بن الولید بے حد بہادر تھے۔ ان کے اندر غیر معمولی فوجی قابلیت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر حضرت ابوبکر کی خلافت تک وہ مسلسل اسلامی فوج کے سردار رہے۔ تاہم حضرت عمر کو ان کی بعض عادتیں پسند نہ تھیں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت ابوبکر سے کہا کہ ان کو سرداری کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔ مگر حضرت ابوبکر نے ان کے مشورہ کو نہیں مانا۔ مگر حضرت عمر کو اپنی رائے پر اتنا اصرار تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے حضرت خالد کو سرداری سے معزول کر کے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت دے دی۔

اس وقت حضرت خالد شام کے علاقہ میں فتوحات کے کارنامے دکھا رہے تھے۔ عین اس وقت خلیفہ ثانی نے انھیں معزول کر کے ابوعبیدہ بن الجراح کو ان کے اوپر سردار لشکر بنا دیا۔ اس کے بعد فوجیوں کی ایک تعداد خالد بن ولید کے خیمہ میں جمع ہوئی اور ان سے کہا کہ ہم آپ کے ساتھ ہیں، آپ خلیفہ کا حکم نہ مانئے۔ مگر حضرت خالد نے سب کو رخصت کر دیا اور کہا کہ میں عمر کے لیے نہیں لڑتا بلکہ عمر کے رب کے لئے لڑتا ہوں (انی لا اقاتل

فی سبیل عمر ولکن اقاتل فی سبیل رب عمر) وہ پہلے سردار لشکر کی حیثیت سے لڑتے تھے اور اب ایک ماتحت فوجی کی حیثیت سے لڑنے لگے۔

اس قسم کا کردار اسی وقت ممکن ہے جب کہ آدمی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ شکایتوں اور تلخیوں سے اوپر اٹھ کر سوچے اس کا رویہ ردعمل کے طور پر نہ بنے بلکہ مثبت فکر کے تحت بنے۔ وہ اللہ میں جینے والا ہو نہ کہ انسانی باتوں میں جینے والا۔

قانونی حد سے آگے بڑھ کر ساتھ دینا

شعبان ۲ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خبر پہنچی کہ قریش کے تمام سرداروں کی رہنمائی میں ایک ہزار کا لشکر مدینہ کی طرف حملہ کرنے کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اس میں چھ سو زرہ پوش تھے اور اسی کے ساتھ ایک سو سواروں کا خصوصی دستہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک بہت نازک وقت تھا۔ آپ نے مدینہ کے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے یہ سوال رکھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہئے، حسب معمول اولاً مہاجرین کے ممتاز افراد اٹھے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کا رب جس بات کا حکم دے رہا ہے اس کی طرف بڑھئے، ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم یہود کی طرح یہ کہنے والے نہیں ہیں کہ تم اور تمھارا خدا جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے ہیں بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ آپ اور آپ کا خدا چل کر لڑیں، ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔ جب تک ہم میں سے ایک آنکھ بھی گردش کر رہی ہے ہم آپ کا ساتھ چھوڑنے والے نہیں۔

مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مہاجرین کی اس قسم کی تقریروں کے باوجود بار بار یہ فرما رہے تھے کہ لوگو مجھے مشورہ دو (اشیروا علیّ ایھا الناس) چنانچہ سعد بن معاذ کھڑے ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، شاید آپ کا رخ ہماری طرف ہے۔ آپ نے کہا، ہاں، اس پر سعد بن معاذ نے انصار کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا: ہم آپ پر ایمان لائے، آپ کی تصدیق کی، اور اس بات کی گواہی دی کہ جو کچھ آپ لائے ہیں، وہ حق ہے، اور اس پر آپ سے سمع وطاعت کا پختہ عہد باندھ چکے ہیں، بس اے خدا کے رسول، آپ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو کر گزرئے، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ اگر آپ ہیں لے کر سمندر کے سامنے جائیں اور اس میں گھس جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ سمندر میں گھس جائیں گے۔ ہم میں سے ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ ہم کو ہرگز یہ ناگوار نہیں ہے کہ آپ ہیں لے کر کل کے دن دشمن سے ٹکرا جائیں۔ ہم جنگ میں ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ مقابلہ کے وقت سچے اترنے والے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ہم سے وہ کچھ دکھائے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پس اللہ کی برکت کے بھروسے پر آپ ہم کو لے کر چلیں۔ (سیرت ابن ہشام)

انصار کے قائد کی اس تقریر کے بعد اقدام کا فیصلہ کر لیا گیا۔

بدر کی جنگ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بار بار انصار کی طرف رخ کرنا بے سبب نہ تھا۔ اس کا ایک خاص پس منظر تھا۔ ابن ہشام اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وذلك انهم حين بايعوه بالعقبة قالوا: يارسول الله، إنا بُرَاءٌ من ذِمامِك حتّى تصلَ إلى ديارنا، فاذا وصلت إلينا فأنت في ذمّتنا نمنعك مما نمنع منه أبناءنا ونساءنا، فكان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخوف الا تكون الانصار ترى عليها نصره الا ممن دهمه بالمدينة من عدوه، وأن ليس عليهم ان يسير بهم الى عدو من بلادهم، (سیرۃ ابن ہشام، جزء ثانی، صفحہ ۲۵۳)

اور ایسا اس لئے ہوا کہ انصار نے جب عقبہ میں بیعت کی تھی تو انھوں نے کہا تھا کہ اے خدا کے رسول، ہم آپ کی ذمہ داری سے بری ہیں یہاں تک کہ آپ ہمارے دیس میں پہنچ جائیں۔ جب آپ ہمارے پاس آجائیں گے تو آپ ہماری ذمہ داری میں ہوں گے اور ہم آپ کا دفاع کریں گے جس طرح ہم اپنے لڑکوں اور عورتوں کا دفاع کرتے ہیں۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ تھا کہ انصار کہیں یہ سمجھتے ہوں کہ ان پر آپ کی مدد کرنا اس وقت ہے جب کہ آپ کا دشمن مدینہ پہنچ کر حملہ کرے۔ ان پر یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ اپنی بستی سے دور جاکر مقابلہ کریں۔

انصار کی بیعت قدیم عربی اصطلاح کے مطابق بیعت نساء (دفاعی بیعت) تھی۔ اس کے مطابق مدینہ سے ۸۰ میل دور بدر کے مقام پر جاکر لڑنا ان کے لئے ضروری نہ تھا۔ مگر انصار نے اس کو اپنے لئے عذر نہیں بنایا۔ وہ قانونی حد کو توڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے اور بدر کے میدان میں جاکر قربانی پیش کی۔

اختلاف سے بچ کر اصل نشانہ پر لگے رہنا

اخرج الطبرانى عن المسور بن مخرمة قال: خرج رسول الله صلى الله عليه وسلم على اصحابه فقال ان الله بعثنى رحمة للناس كافة فادوا عنى رحمكم الله، ولا تختلفوا كما اختلف الحواريون على عيسى بن مريم فانه دعاهم الى مثل ما ادعوكم اليه فاما من بَعُدَ مكانه فكرهه فشكا عيسى بن مريم ذلك الى الله عزوجل --- فقال اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم نحن يا رسول الله نؤدّى اليك فابعثنا حيث شئت

مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے سامنے تقریر کی اور فرمایا کہ اللہ نے مجھ کو تمام انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ پس تم میری طرف سے اس ذمہ داری کو ادا کرو۔ خدا تم پر رحم کرے۔ اور تم لوگ اختلاف نہ کرنا جس طرح عیسیٰ بن مریم کے حواریوں نے اختلاف کیا۔ انھوں نے اپنے حواریوں کو اسی چیز کے لئے پکارا جس کی طرف میں تم کو پکار رہا ہوں۔ پس جس کا مقام دور تھا اس کو وہاں جانا ناگوار ہوا۔ تو عیسیٰ بن مریم نے اللہ تعالیٰ سے اس کی شکایت کی۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب نے کہا کہ اے خدا کے
رسول ہم آپ کی ذمہ داری کو ادا کریں گے۔ آپ ہم کو بھیجئے
جہاں آپ چاہیں۔

اجتماعی کام میں رکاوٹ ڈالنے والی سب سے بڑی چیز اختلاف ہے۔ مگر صحابہ کرام کو اللہ کے خوف نے اتنا بے نفس بنا دیا تھا کہ وہ اختلافات سے بلند ہو کر اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ کے زمانے میں انھوں نے عرب میں اور اطراف عرب میں آپ کی منشا کے مطابق اسلام کی دعوت پوری طرح پہنچائی۔ آپ کی وفات کے بعد وہ مال و جاہ کے حصول میں نہیں پڑے بلکہ اطراف کے ملکوں میں پھیل گئے۔ ہر صحابی کا گھر اس زمانہ میں ایک چھوٹا مدرسہ بنا ہوا تھا جہاں وہ صرف اللہ کی رضا کے لئے لوگوں کو عربی سکھاتے اور قرآن وسنت کی تعلیم دیتے۔ اس زمانہ میں ایک طرف مسلمانوں کا ایک طبقہ فتوحات اور سیاسی انتظامات میں لگا ہوا تھا۔ عام طریقہ کے مطابق اصحاب رسول کو اپنا سیاسی حصہ لینے میں سرگرم ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اس سے بے پروا ہو گئے۔ انھوں نے اسلامی فتوحات کے ذریعہ پیدا ہونے والی فضا کو تبلیغ دین کے لئے استعمال کیا، اس طرح ان کے اور ان کے شاگردوں کے خاموش پچاس سالہ عمل کے نتیجہ میں وہ جغرافی خطہ وجود میں آیا جس کو عرب دنیا کہا جاتا ہے، جہاں لوگوں نے نہ صرف اپنے دین کو بدلا بلکہ ان کی زبان اور ان کی تہذیب بھی بدل گئی۔

پچھلی نشست پر بیٹھنے کے لئے راضی ہو جانا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو سب سے پہلا مسئلہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ انصار بنو ساعدہ کی چوپال (سقیفہ) میں جمع ہو گئے۔ اس وقت سعد بن عبادہ انصار کے سب سے زیادہ ابھرے ہوئے سردار تھے۔ چنانچہ انصار میں بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ مقرر کیا جانا چاہئے۔ مہاجرین کو یہ خبر ملی تو ان کے ممتاز افراد تیزی سے چل کر مذکورہ مقام پر پہنچے۔ حضرت ابوبکر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

أما ما ذكرتم فيكم من خيرٍ فأنتم له اهل، ولن تعرف العرب هذا الأمر الا لهذا الحي من قريش: هم اوسط العرب نسبًا و دارًا، وقد رضيت لكم احد هذين الرجلين فبايعوا ايهما شئتم

(سیرۃ ابن ہشام، جزء رابع صفحہ ۳۳۹)

(اے انصار) تم نے اپنی جس فضیلت کا ذکر کیا ہے اس کے تم اہل ہو۔ مگر عرب اس معاملہ (امارت) کو قریش کے سوا کسی اور قبیلہ کے بارے میں نہیں جانتے۔ وہ عربوں میں نسب اور مقام کے اعتبار سے سب سے بہتر ہیں۔ میں تمہارے لئے ان دو آدمیوں (عمر اور ابو عبیدہ بن الجراح) میں سے کسی ایک پر راضی ہوں۔ تم دونوں میں سے جس سے چاہو بیعت کر لو

اس کے بعد حضرت عمرؓ اٹھے اور انھوں نے فوراً حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرلی اور پھر تمام مہاجرین نے بیعت کی۔ اس کے بعد انصار نے بھی حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ تاہم انصار کے ایک طبقہ کے لئے یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ ایک شخص نے مہاجرین سے کہا کہ تم لوگوں نے سعد ابن عبادہ کو قتل کر دیا (قتلتم سعد ابن عبادۃ)

انصار نے اسلام کے لئے بے پناہ قربانیاں دی تھیں۔ انھوں نے اسلام کے بے یار و مددگار قافلہ کو اس وقت پناہ دی جب کہ انھیں اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انصار اس فیصلہ پر راضی ہوگئے کہ اقتدار میں ان کا حصہ نہ ہو اور خلیفہ صرف مہاجرین (قریش) میں سے منتخب کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے پیچھے بہت گہری مصلحت تھی۔ قریش سیکڑوں سال سے عرب کے قائد بنے ہوئے تھے۔ ایسی حالت میں اگر کسی غیر قریش کو خلیفہ مقرر کیا جاتا تو اس کے لئے اجتماعی نظم کو سنبھالنا ناممکن ہو جاتا۔ یہ انصار کی حقیقت پسندی تھی کہ انھوں نے اپنی اس کمی کو جانا اور یک طرفہ فیصلہ پر راضی ہوگئے۔ تاہم یہ حقیقت پسندی کی اتنی نایاب قسم ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

غیر جذباتی فیصلہ کرنے کی طاقت

احد کی لڑائی اسلام کی تمام جنگوں میں سب سے زیادہ سخت لڑائی تھی۔ قریش کے تمام جنگی جوان غصہ میں بھرے ہوئے مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑے تھے۔ عین اس وقت جب کہ قتل وخون کا معرکہ گرم تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ہاتھ میں لی اور کہا کون اس تلوار کو اس کے حق کے ساتھ لے گا۔ کچھ لوگ آپ کی طرف بڑھے۔ مگر آپ نے انھیں تلوار نہ دی۔ پھر ابو دجانہ سامنے آئے اور پوچھا کہ اے خدا کے رسول اس تلوار کا حق کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس سے دشمن کو مارو یہاں تک کہ اس کو ٹیڑھا کر دو (ان تضرب بہ العدو حتی ینحنی)۔ ابو دجانہ نے کہا کہ میں اس کو اس کے حق کے ساتھ لیتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے انھیں تلوار دے دی۔

حضرت ابو دجانہ تلوار لے کر چلے۔ اس وقت ان پر ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اس قسم کی چال خدا کو پسند نہیں سوا ایسے موقع کے (انہا لمشیۃ یبغضہا اللہ الا فی مثل ھذا الموطن)

ابو دجانہ نے اپنے سر پر لال کپڑا باندھ لیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ موت سے نڈر ہو کر جنگ کے لئے نکل پڑے ہیں۔ وہ انتہائی بہادری کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ جو بھی ان کے سامنے آتا وہ ان کی تلوار کا نشانہ بن جاتا۔ اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جس کو خود ابو دجانہ ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

رایت انسانا یحمش الناس حمشا شدیدا　　میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بری طرح لوگوں کو جنگ

فصمدت لہٗ فلما حملت علیہ السیف ولول فاذا امرأة فاکرمت سیف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اضرب بہ امرأة

(سیرت ابن ہشام جز ۳، صفحہ ۱۴)

پر ابھار رہا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا۔ جب میں نے اس پر تلوار اٹھائی تو اس نے کہا یا ویلاہ (ہائے تباہی) اب میں نے جانا کہ یہ ایک عورت ہے۔ تو میں نے خدا کے رسول کی تلوار کو اس سے پاک رکھا کہ اس سے میں کسی عورت کو قتل کروں

اس واقعہ کو ایک صحابی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: پھر میں نے دیکھا کہ ان کی تلوار ہند بنت عتبہ کے سر پر اٹھ گئی ہے مگر اس کے بعد انھوں نے اپنی تلوار اس سے ہٹالی (ثم رایتہ قد حمل السیف علی مفرق راس ھند بنت عتبۃ، ثم عدل السیف عنہا) جنگ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات میں سے ایک ہدایت یہ تھی کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ حضرت ابو دجانہ نے عین قتل و خون کے ہنگامہ میں اس کو یاد رکھا اور اپنی چلی ہوئی تلوار کو درمیان سے روک لیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اصحاب رسول کو اپنے جذبات پر کتنا زیادہ قابو تھا۔ ان کے افعال ان کے شعور کے ماتحت تھے نہ کہ ان کے جذبات کے ماتحت۔ وہ انتہائی اشتعال انگیز موقع پر انتہائی ٹھنڈا فیصلہ کرسکتے تھے۔ وہ غصہ اور انتقام کی آخری حد پر پہنچ کر بھی اچانک اپنا ذہن تبدیل کرسکتے تھے۔ وہ ایک رخ پر پوری رفتار سے چل پڑنے کے بعد معاً اپنا رخ دوسری طرف پھیر سکتے تھے۔ یہ بظاہر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر عملاً وہ اتنی زیادہ مشکل ہے کہ اس پر کوئی ایسا شخص ہی قادر ہوسکتا ہے جو خدا سے اس طرح ڈرنے والا ہو گویا خدا اپنے تمام جلال و جبروت کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا ہوا ہے اور وہ اس کو اپنی کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

درخت کی طرح آگے بڑھنا

قرآن میں انجیل اور تورات کے دو حوالوں کا ذکر ہے۔ تورات کا حوالہ صحابۂ کرام کے انفرادی اوصاف سے متعلق ہے۔ اس کے بعد انجیل کے حوالے سے ان کی اجتماعی صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہٗ فآزرہ فاستغلظ فاستوی علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار وعد اللہ الذین آمنوا و عملوا الصالحات منھم مغفرۃ واجرا عظیما

(الفتح۔ آخر)

اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو۔ اس نے نکالا اپنا انکھوا۔ پھر اس کو مضبوط کیا۔ پھر وہ موٹا ہوا۔ پھر اپنے تنہ پر کھڑا ہوگیا۔ اچھا لگتا ہے کسانوں کو تاکہ منکروں کا دل ان سے جلائے۔ اللہ نے ان لوگوں سے جو ان میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کئے مغفرت اور اجر عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

موجودہ انجیل میں یہ تمثیل ان لفظوں میں ہے ——— اور اس نے کہا، خدا کی بادشاہی ایسی ہے جیسے کوئی

آدمی زمین میں بیج ڈالے اور رات کو سوئے اور دن کو جاگے۔ اور وہ بیج اس طرح اُگے اور بڑھے کہ وہ نہ جانے۔ زمین آپ سے آپ پھل لاتی ہے۔ پتی، پھر بالیں، پھر بالوں میں تیار دانے۔ پھر جب اناج پک چکا تو وہ فی الفور درانتی لگاتا ہے۔ کیونکہ کاٹنے کا وقت آپہنچا (مرقس ۴: ۳۲-۲۶)

انجیل اور قرآن کی اس تمثیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر آخرالزماں کے اصحاب کا اجتماعی ارتقاء درخت کی مانند ہوگا۔ اس کا آغاز بیج سے ہوگا، پھر وہ دھیرے دھیرے بڑھے گا اور اپنا تنہ مضبوط کرتے ہوئے اوپر اٹھے گا۔ یہاں تک کہ فطری رفتار سے تدریجی ترقی کرتے ہوئے اپنے کمال کو پہنچ جائے گا۔ اس کی ترقی اتنی شاندار ہوگی کہ ایک طرف اہل ایمان اس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسری طرف دشمن دانت پیس رہے ہوں گے کہ اس کا معاملہ اتنا مضبوط ہے کہ اس کے خلاف ہمارا کچھ بس نہیں چلتا۔

اسلام کو درخت کی طرح ترقی دینے کے لئے خدا کا یہ منصوبہ تھا جو صحابہ کرام کے ذریعہ انجام پایا۔ تاہم یہ کوئی آسان معاملہ نہ تھا۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ جلد بازی کے بجائے صبر کو اپنا طریقہ بنائیں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ فوری محرکات کے تحت وہ کوئی اقدام نہ کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے ذوق پر چلنے کے بجائے قوانین فطرت کی پیروی کریں۔ اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اس سے بے پرواہو کر کام کریں کہ نتیجہ ان کی زندگی میں سامنے آتا ہے یا ان کے بعد۔ "درخت اسلام" کو اگانے کے لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنے جذبات کو کچلیں اور اپنی امنگوں کو دفن کر دیں۔ صحابہ کرام نے یہ سب کچھ کیا۔ انھوں نے کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو خدائی اسکیم کے حوالہ کر دیا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ زمین میں خدا کا دین ایک ایسے ابدی باغ کی صورت میں کھڑا ہو گیا جس کو ساری دنیا مل کر بھی مٹانا چاہے تو نہ مٹا سکے۔

مردانِ کار کی ضرورت

اکثر لوگ احیاء اسلام کی مہم کو اس کے "پروگرام" میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کو اسی وقت سمجھ پاتے ہیں جب کہ انھیں ایک متعین پروگرام بتا دیا جائے۔ مگر پروگرام کو تحریک کا بدل سمجھنا تحریک کی وسعتوں کی تصغیر (Underestimation) ہے۔ پروگرام ایک محدود نقشۂ کار کا نام ہے اور انسانی زندگی اس سے زیادہ وسیع ہے کہ وہ کسی محدود نقشہ کار کے دائرہ میں سما سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑا پروگرام خود افراد کو پروگرام ساز بنانا ہے نہ کہ افراد کے ہاتھوں میں کوئی لگا بندھا پروگرام دینا۔

اسلامی دعوت یہی کام کرتی ہے۔ حقیقی اسلامی دعوت افراد کے ذہن کو اس طرح جگا دیتی ہے کہ وہ خود پروگرام ساز بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں صرف توحید کی دعوت پیش کی تھی۔ آپ نے اس قسم کی کوئی چیز لوگوں کو نہیں دی جس کو موجودہ زمانہ میں "پروگرام" کہا جاتا ہے۔ اس کے باوجود ہر وہ شخص جو آپ کی دعوت سے متاثر ہوتا اس کو اپنے لئے مکمل پروگرام مل جاتا تھا۔ وہ آپ سے توحید کا شعور لینے کے بعد خود ہی سارا کام کرنے لگتا تھا۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ مکہ چھوڑ کر حبش گئے ان کو آپ نے معروف معنوں میں کوئی پروگرام نہیں بتایا تھا۔ مگر انھوں نے حبش میں اسلام کی اتنی کامیاب نمائندگی کی کہ اسلام بین اقوامی دعوت کے مرحلہ میں داخل ہو گیا۔ آپ کی ہجرت سے پہلے جو مسلمان مدینہ گئے ان کو آپ نے قرآن کی سورتوں کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ مگر انھوں نے مدینہ میں اسلامی دعوت کی مہم اس طرح چلائی کہ صرف چند سالوں میں مدینہ اس قابل ہو گیا کہ وہ دار الہجرت (اسلام کا مرکز) بن سکے۔

تقلیدی مذہب سے ہٹا کر شعوری مذہب پر لانے کی مہم سب سے بڑی انقلابی مہم ہے۔ وہ ایسے افراد وجود میں لاتی ہے جو اپنی ذات میں مکمل پروگرام ہوتے ہیں۔ ایسی مہم کی زد انسان کے پورے وجود پر پڑتی ہے۔ وہ انسانی فطرت کو اس طرح جگاتی ہے کہ اس کے اندر ربانی حکمت کا چشمہ ابل پڑے۔ اب ایسے انسان وجود میں آتے ہیں جو خدا کے پاؤں سے چلیں، جو خدا کے ہاتھ سے پکڑیں، جو خدا کی آنکھ سے دیکھیں اور خدا کے کان سے سنیں۔ وہ حدیث کے الفاظ میں، وہ بے پناہ انسان بن جائیں جس کی ہوش مندی ہر دوسری چیز سے بلند تر ثابت ہوتی ہے (اتقوا فراسة المومن فانه ینظر بنور الله) ایسا آدمی خود ہر چیز کا بدل بن جاتا ہے۔ اس کے پاس ہر سوال کا صحیح ترین جواب ہوتا ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنے لئے کامیاب ترین راہ عمل تلاش کر لیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب میں یہی حکمت ربانی جگا دی تھی، اس کے بعد انھیں کسی اور چیز کی ضرورت نہ رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے انسان کی فطرت میں وہ سب کچھ بھر دیا ہے جس کی اسے اپنی زندگی میں ضرورت ہے۔ عام حالات میں یہ فطرت ڈھکی ہوئی رہتی ہے۔ اسی انسانی فطرت سے جمود اور تعصب اور بے شعوری کے پردوں کو ہٹانا اسلامی دعوت کا اصل کام ہے۔ ان پردوں کے ہٹتے ہی انسانی فطرت اس آفاقی روشنی میں آجاتی ہے جس سے تمام زمین و آسمان جگمگا رہے ہیں۔ اس کے بعد ہر چیز اس کو اپنے واقعی روپ میں دکھائی دینے لگتی ہے۔ اور جو آدمی چیزوں کو ان کے واقعی روپ میں دیکھے اس کے لئے پروگرام کا مسئلہ اتنا ہی آسان ہو جاتا ہے جتنا آنکھ والے ایک شخص کے لئے سیڑھی کے زینوں پر قدم رکھتے ہوئے کسی عمارت کے اوپر چڑھنا۔

یہاں میں ایک واقعہ نقل کروں گا جو اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ واضح کرتا ہے۔

ایک ہندستانی خاتون اپنے شوہر کے ساتھ طرابلس میں رہتی تھیں۔ وہ عربی نہیں جانتی تھیں۔ وہاں ان کی زندگی بالکل گھریلو زندگی تھی۔ باہر کی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ایک روز رات کو اچانک ان کے شوہر کے پیٹ میں سخت درد اٹھا۔ گھر میں بیوی کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا جو ڈاکٹر کو بلائے۔ طرابلس میں گھریلو ٹیلی فون بھی نہیں ہوتے کہ ٹیلی فون پر ڈاکٹر یا اسپتال سے رابطہ قائم کیا جائے۔ مگر بستر پر تڑپتا ہوا شوہر اور اس سے قلبی تعلق خاتون کے لئے اپنی ہر کمی کا بدل بن گیا۔ وہ رات کے سناٹے میں اپنے گھر سے نکلی۔ راستہ سے ناواقفیت، مقامی زبان سے اجنبیت، کسی ڈاکٹر کا نام یا پتہ معلوم نہ ہونا کوئی بھی چیز اس کے لئے رکاوٹ نہ بنی۔ وہ اپنی بیتابی کی رہنمائی میں چلتی رہی۔ یہاں تک کہ بے شمار مرحلوں سے گزرنے کے بعد بالآخر وہ ایک پاکستانی ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئی۔ پاکستانی ڈاکٹر اس کی زبان (اردو) جانتا تھا۔ وہ فوراً اس کے ساتھ آیا۔ دیکھنے کے بعد اس نے سمجھ لیا کہ یہ اپنڈکس کا کیس ہے اور اس کا فوراً آپریشن ہونا چاہئے، چنانچہ اسی وقت وہ اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا کر اسپتال لے گیا۔ وہاں اس کا آپریشن ہوا اور چند دن کے بعد وہ اچھا ہو کر اپنے گھر واپس آگیا۔

اس قسم کا واقعہ ہر آدمی کی زندگی میں پیش آتا ہے۔ ہر آدمی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے جس کے بارے میں پہلے سے اس کے پاس کوئی نقشۂ عمل نہیں ہوتا۔ مگر وہ پوری طرح اس کا مقابلہ کرتا ہے اور بالآخر کامیاب ہو جاتا ہے۔ تاہم اس قسم کے قصے کسی کے ساتھ ہمیشہ اپنے بیوی، بچوں اور اپنے ذاتی معاملات میں پیش آتے ہیں۔ اگر تعلق اور دلچسپی کا یہی درجہ دین کے ساتھ پیدا ہو جائے تو دین کے معاملات بھی اسی طرح حل ہونے لگیں جس طرح لوگ اپنے ذاتی معاملات روزانہ حل کر رہے ہیں۔ پھر لوگوں کے لئے نہ دینی تقاضوں کو جاننا مشکل رہے اور نہ دین کے لئے قربانی دینا۔ وہ اپنے پروگرام کو اسی طرح پالیں جس طرح مذکورہ خاتون نے اپنے ڈاکٹر کو پالیا۔

ہم سے اکثر کہا جاتا ہے کہ آپ کے پاس نقشۂ کار کیا ہے۔ آہ، لوگوں کو کس طرح بتایا جائے کہ نقشۂ کار کی نہیں بلکہ مردانِ کار کی ضرورت ہے۔ کوئی واقعہ خواہ وہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، اس کو برپا کرنے والے ہمیشہ انسان ہوتے ہیں۔ نہ کہ کوئی پروگرام یا نقشۂ کار۔ اجتماعی زندگی میں انقلاب ہمیشہ وہ لوگ لاتے ہیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں نہ کہ وہ لوگ جنھیں کوئی لگا بندھا ڈھرا دے دیا جائے اور اس پر وہ دوڑتے رہیں۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کا واقعہ ہے۔ ایک بار انھوں نے نماز پڑھی۔ نماز کے بعد انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ہاتھ اٹھائے خاموش دعا کرتے رہے۔ اس وقت اورنگ زیب کے پیچھے ان کے وزیر سعد اللہ خاں کھڑے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب جب دعا سے فارغ ہوئے تو سعد اللہ خاں نے کہا: عالی جاہ، آپ کی سلطنت کا پرچم کشمیر سے لے کر راس کماری تک لہرا رہا ہے، کیا اس کے بعد بھی کوئی ارمان ہے جو آپ کے دل میں باقی رہ گیا ہے۔ اورنگ زیب یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور اس کے بعد تاثر کے ساتھ کہا: سعد اللہ، مردے خواہم (سعد اللہ، میں ایک مرد چاہتا ہوں)

اورنگ زیب کے پاس وہ چیز مکمل طور پر موجود تھی جس کو نقشۂ کار کہا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ اس کے پاس حکومت اور وسائل بھی پوری طرح موجود تھے۔ اس کے باوجود وہ مغل سلطنت کو مستحکم بنانے میں اس لئے ناکام ہو گیا کہ اس کے پاس مردانِ کار نہ تھے۔ اگر اورنگ زیب کے پاس سچے مردان کار کی ٹیم موجود ہوتی تو اورنگ زیب کے بعد آنے والی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ اب ہمیں نظر آتی ہے۔

اسلام کے مشن کو آج انسانوں کی بھیڑ میں انسان کی تلاش ہے۔ خدا کے نام پر بولنے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس کو خدا کے خوف نے چپ کر رکھا ہو، دنیا کے پیچھے دوڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کی راہ دیکھ رہا ہے جو آخرت کی خاطر کھڑا ہو گیا ہو۔ خدا کے نام پر خوشیاں منانے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کو خدا کی یاد نے رونے پر مجبور کر دیا ہو۔ اپنی انا کا جھنڈا اٹھانے والوں کے درمیان اس کو اس انسان کی تلاش ہے جس نے خدا کو اس طرح پایا ہو کہ اس کے پاس ایک بے انا روح کے سوا اور کچھ باقی نہ رہ گیا ہو۔ دین کے نام پر لڑنے والوں کے درمیان وہ اس انسان کو تلاش کر رہا ہے جس نے دین کی خاطر لڑائی بھڑائی چھوڑ دی ہو۔ حاسبوا اغیارکم کا جھنڈا اٹھانے والی فوج کے درمیان وہ ان لوگوں کا انتظار کر رہا ہے جو حاسبوا انفسکم کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہوں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آج اسلام کو مطلوب ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ذریعہ اسلام دوبارہ فکری غلبہ کا مقام حاصل کرے گا۔

آج اسلام کو ایسے انسان درکار ہیں جو اپنے کو اس حد تک خالص کریں کہ وہ ظواہر سے گزر کر حقیقت کو دیکھنے لگیں۔ جو اس صبر کے حامل ہوں کہ غیر متعلق مسائل سے اپنا دامن بچا کر اصل نشانہ پر اپنی ساری توجہ مرکوز

رکھیں۔ جو آخرت کے مقابلہ میں دنیا کو اتنا ہیچ سمجھیں کہ دنیا کی ہر قربانی دینا ان کے لئے آسان ہو جائے۔ جو اتنے زیادہ حقیقت پسند ہوں کہ اپنے مقابلہ میں دوسروں کی خوبی دیکھ سکیں اور اپنی سیٹ پر دوسرے کو بٹھا سکیں۔ جو حقائق کو اس طرح دیکھنے لگیں کہ کوئی لفظی شوشہ انھیں اس سے بدکانے والا ثابت نہ ہو۔ جو منفی جذبات سے اس قدر خالی ہوں کہ کوئی ذاتی رنجش انھیں منحرف نہ کر سکے اور کسی کی ترقی انھیں حسد میں مبتلا نہ کرے۔ جو دوسرے کو اپنے مقام پر رکھ کر دیکھیں اور اپنے کو دوسرے کے مقام پر۔ جو ظواہر سے زیادہ حقیقت کے دلدادہ ہوں۔ اور حال سے زیادہ مستقبل پر نظر رکھتے ہوں۔ خلاصہ یہ کہ وہ دنیا کے بجائے آخرت میں جیتے ہوں اور اپنی بڑائی کے بجائے خدا کی بڑائی میں گم ہو چکے ہوں۔ ایسے ہی لوگوں نے دور اول میں اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کیا تھا اور ایسے ہی لوگ دور ثانی میں بھی اسلام کو غالب فکر کا مقام عطا کریں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروگرام کا سوال اصلاً افراد تیار کرنے کا سوال ہے۔ افراد کسی تربیتی نظام میں نہیں ڈھلتے اور نہ کسی قسم کے خارجی ہنگاموں کے درمیان بنتے ہیں۔ افراد تیار کرنے کی صورت تو صرف یہ ہے کہ دین قیم کی بنیاد پر ایک ایسی بے آمیز تحریک اٹھے جو فطرت انسانی کو مس کرنے والی ہو۔ جو آدمی کے باطن میں ضرب لگا کر اس کے اندر سوئے ہوئے ربانی انسان کو جگا دے، جو انسان کے فکر میں خدا کا رنگ اس طرح گھولے کہ اس کی پوری ہستی خدا کے رنگ میں رنگ جائے۔

ایسی تحریک حالات کے ردعمل کے طور پر نہیں اٹھتی۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کا ابدی نغمہ چھیڑنے کے ہم معنی ہوتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی کی حکمت کو لسان عصر میں کھولتی ہے۔ وہ پیغمبرانہ دعوت کا زمانی اظہار ہوتی ہے۔ وہ خدا اور انسان کے درمیان رابطہ بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ سورج کی روشنی اور پھولوں کی مہک کی طرح خدا کے تخلیقی حسن کا نمونہ ہوتی ہے۔ کسی معاشرہ میں ایسی تحریک کا اٹھنا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہاں وہ ربانی انسان ابھر کر اٹھیں جو اپنی ذات میں پروگرام ہوں۔ تاہم پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی دعوت اٹھنے کے بعد بھی عملاً صرف وہی لوگ اس سے فیض یاب ہوتے ہیں جو پہلے سے اپنے اندر زرخیزی کا مادہ رکھتے ہوں۔ بنجر زمین بارش سے پہلے بھی بنجر رہتی ہے اور بارش کے بعد بھی بنجر (والبلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا، الاعراف ۵۸)

اسلام کی نئی تاریخ شروع کرنے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ انسانوں کی ایسی جماعت ہے جس کی فطری صلاحیتیں زندہ ہوں۔ تاکہ اس کو جب اسلام کی دعوت فطرت کا مخاطب بنایا جائے تو وہ اس کو صحیح طور پر قبول کر سکے۔ جب اس کے اندر اسلام کا بیج ڈالا جائے تو اس کی کھیتی اس طرح لہلہا اٹھے جس طرح زرخیز زمین میں دانہ ڈالنے کے بعد اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ اسلام کی دعوت اپنی قبولیت کے لئے آج ایسے کسی گروہ کا۔

انتظار کررہی ہے۔ اس قسم کے زندہ افراد اگر مسلمانوں میں سے نکل آئیں تو یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی ہے اور اگر ایسے جاندار لوگ مسلمانوں میں سے نہ نکلیں تو خدا کسی دوسری قوم کو یہ توفیق دے گا اور اس کے اندر سے ایسے زندہ افراد اٹھائے گا جو اسلام کی بارش سے نہائیں اور دنیا کو اس میں نہلانے کے لئے اپنا سب کچھ لگادیں (فان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لایکونوا امثالکم)

اوپر ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ جنگ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے متعلق دعا کی کہ خدایا یہ گروہ (العصابہ) اگر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد زمین پر تیری عبادت نہ ہوگی۔ یہ اصحاب بدر کُل ۳۱۳ تھے۔ مگر یہی ۳۱۳ کی تعداد رسول کی نظر میں فیصلہ کن بن گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے غلبہ کے لئے اصل میں جو چیز درکار ہے وہ کسی قسم کی بھیڑ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ بھیڑ کے اندر دعوتی عمل کرکے اس کے زندہ افراد کو اس سے نکال لیا جائے۔ یہ زندہ افراد خواہ ۳۱۳ ہوں مگران کو انسانیت کا خلاصہ ہونا چاہئے۔ شعور کے اعتبار سے وہ شعور ربانی کے ہم سطح ہوں اور عمل کے اعتبار سے وہ اخلاق خداوندی کا پیکر بن چکے ہوں۔ ان کا سوچنا اور کرنا دونوں خدا کی میزان عدل میں پورا اتر رہا ہو۔ ایسے گروہ کو چھانٹ کر نکالنا ہی دعوت اسلامی کا اصل مقصود ہے۔ جس دن ایسا گروہ وجود میں آجائے گا تو خواہ وہ ۳۱۳ جیسی اقلیت میں کیوں نہ ہو وہ خدا کی مدد سے خدا کے دین کو غلبہ کے مقام پر پہنچا کر رہے گا۔ ایسا ایک گروہ ہمیشہ خدا کی فرقان ہوتا ہے۔ اور جو گروہ خدا کی فرقان بن جائے اس کے لئے اس دنیا میں غلبہ کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔

اسلام دورجدید میں

اسلام چونکہ آخری دین ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے وجود کے اعتبار سے قیامت تک باقی رہے۔ اسی لئے دین کا تحفظ بھی ایک ضروری اور مطلوب کام ہے۔ موجودہ زمانہ کی بعض تحریکوں نے اس اعتبار سے یقیناً مفید خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اسلام کے فکری اور عملی نقشہ کی محافظ ثابت ہوئی ہیں۔ بعض ادارے قرآن اور حدیث اور اسلامی مسائل کے علم کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ بعض جماعتیں اسلامی عبادات کے ڈھانچہ کو ایک نسل سے دوسری تک پہنچانے کا کام کررہی ہیں۔ کچھ اور ادارے قرآن و حدیث کا متن صحت و صفائی کے ساتھ چھاپ کر ہر جگہ پھیلا رہے ہیں۔ یہ تمام کام بجائے خود مفید ہیں مگر بہرحال وہ تحفظ دین کے کام ہیں نہ کہ دعوتِ دین کے۔ جہاں تک اسلام کو دعوتی قوت کی حیثیت سے زندہ کرنے کا سوال ہے وہ موجودہ زمانہ میں ابھی تک واقعہ نہ بن سکا۔ حتیٰ کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو شاید اس کا شعور بھی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر ایسے کاموں کو اسلامی دعوت کا عنوان دے دیتے ہیں جن کا اسلامی دعوت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

موجودہ زمانہ میں کسی حقیقی اسلامی کام کے آغاز کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس صورت حال کو ختم کریں جس نے ساری دنیا میں اسلامی تحریک کو سیاسی تحریک کے ہم معنی بنا رکھا ہے۔ مسلمان ہر ملک میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف شور و شر برپا کرنے میں مشغول ہیں۔ کہیں ان کی یہ تحریک غیر مسلم اقتدار کے خلاف برپا ہے اور کہیں مسلم اقتدار کے خلاف۔ کہیں وہ مسلح جدوجہد کے روپ میں ہے اور کہیں زبانی اور قلمی احتجاج کے روپ میں۔ کہیں وہ ایک اسلامی سیاسی فلسفہ کے زیر سایہ کام کر رہی ہے اور کہیں فلسفہ اور نظریہ کے بغیر متحرک ہے۔ کہیں اس نے ملی عنوان اختیار کر رکھا ہے اور کہیں نظامی عنوان۔ تاہم سارے فرق و اختلاف کے باوجود نتیجہ سب کا ایک ہے ــــ جدید امکانات کو دعوت توحید اور انذار آخرت کے لئے استعمال نہ کرنا اور اپنی قوتوں کو بے فائدہ طور پر مفروضہ حریفوں کے خلاف محاذ آرائی میں ضائع کرتے رہنا۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو مسلمانوں نے موجوہ زمانہ میں بالکل الٹی کارکردگی کا ثبوت دیا ہے۔ خدا نے دعوتِ حق کی راہ سے سیاسی رکاوٹ کو دور کر کے انھیں موقع دیا تھا کہ وہ آزادانہ حالات میں خدا کے تمام بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔ وہ خدا کے بندوں کو خدا کی اس اسکیم سے باخبر کر دیں جس کے تحت اس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جس کے مطابق وہ ایک ایک شخص کا حساب لینے والا ہے۔ مگر انھوں نے دوبارہ نئے نئے عنوان سے اپنے خلاف سیاسی رکاوٹیں کھڑی کر لیں۔ خود ساختہ سیاسی جہاد میں ہر ایک مشغول ہے۔ مگر دعوتی جہاد میں اپنا حصہ ادا کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔

قرآن میں ہے کہ اللہ اس کی مدد کرتا ہے جو اللہ کی مدد کرے (حج ۴۰) ہر دور میں خدا اپنے دین کے حق میں کچھ امکانات کھولتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ کچھ لوگ ہوں جو خدا کے اشارہ کو سمجھیں اور خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شامل کر دیں۔ صحابہ کرام وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں خدائی منصوبہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالہ کر دیا۔ اس کا نتیجہ وہ عظیم انقلاب تھا جس نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا۔

بارش کا آنا خدا کے ایک منصوبہ کا خاموش اعلان ہے۔ یہ کہ آدمی اپنا بیج زمین میں ڈالے تاکہ خدا اپنے کائناتی انتظام کو اس کے موافق کر کے اس کے بیج کو ایک پوری فصل کی صورت میں اس کی طرف لوٹائے۔ کسان اس خدائی اشارہ کو فوراً سمجھ لیتا ہے اور اپنے آپ کو اس خدائی منصوبہ میں پوری طرح شامل کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ایک لہلہاتی ہوئی فصل کی صورت میں اس کو واپس ملتا ہے۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں، ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں، اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے حق میں کچھ نئے مواقع کھولے تھے۔ یہ مواقع کہ اقتدار کا حریف بنے بغیر توحید اور آخرت کی دعوت کو عام کیا جائے۔ جو کام پہلے معجزاتی سطح پر انجام دینا پڑتا تھا، اس کو عام طبیعیاتی استدلال کی سطح پر انجام دیا جائے۔ جو کام پہلے تعصب کے ماحول میں کرنا پڑتا تھا اس کو مذہبی رواداری

کے ماحول میں کیا جائے۔ جو کام پہلے "حیوانی رفتار" سے کیا جاتا تھا اس کو "مشینی رفتار" کے ساتھ انجام دیا جائے۔

یہ موجودہ زمانہ میں خدا کا منصوبہ تھا۔ خدا نے سارے بہترین امکانات کھول دئے تھے اور اب صرف اس کی ضرورت تھی کہ خدا کے کچھ بندے ان کو استعمال کر کے ان امکانات کو واقعہ بننے کا موقع دیں۔ مگر مسلم قیادت خدا کے اس منصوبہ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اس نے نئے نئے عنوانات کے تحت وہی سیاسی جھگڑے دوبارہ چھیڑ دئے جن کو خدا نے ہزار سالہ عمل کے نتیجہ میں ختم کیا تھا۔ انھوں نے اسلامی دعوت کو سیاسی اور قومی دعوت بنا کر دوبارہ اسلام کو اقتدار کا حریف بنا دیا اور کہا کہ یہی عین خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو قوموں کے ساتھ ہر جگہ بالکل بے فائدہ قسم کی مقابلہ آرائی شروع ہو گئی اور سارے نئے امکانات غیر استعمال شدہ حالت میں پڑے رہ گئے۔ مسلمانوں اور دیگر قوموں کے درمیان داعی اور مدعو کا رشتہ قائم نہ ہو سکا۔

کام کی ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت مسلمانوں نے کھو دی۔ یہاں تک کہ شیطان نے بیدار ہو کر قدیم شرک کی جگہ جدید شرک (کمیونزم) کی صورت میں کھڑا کر دیا۔ اب کم از کم کمیونزم کے زیر تسلط علاقوں میں دوبارہ کام کرنے کی وہی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے شرک کے زیر تسلط علاقوں میں پائی جاتی تھیں۔ تاہم غیر کمیونسٹ دنیا میں اب بھی کام کے مواقع کھلے ہوئے ہیں اور یہاں پندرھویں صدی ہجری میں اس صالح جدوجہد کا آغاز کیا جا سکتا ہے جو چودھویں صدی ہجری میں نہ کیا جا سکا۔

اللہ تعالیٰ نے ابدی طور پر اسلام کو ایک غالب نظریے کی حیثیت دے دی ہے۔ اسی کے ساتھ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر دور میں وہ موافق حالات فراہم کیے جاتے ہیں جو اسلام کو تمام دوسرے افکار پر غالب کرنے کی ضمانت ہوں۔ موجودہ زمانے میں یہ موافق امکانات پوری طرح جمع ہو چکے ہیں۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اُن کو حکمت اور دانش مندی کے ساتھ استعمال کر کے اِس امکان کو واقعہ بنا دیا جائے۔
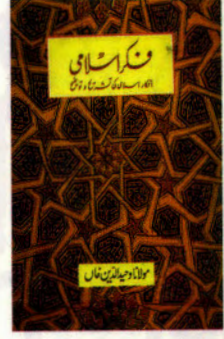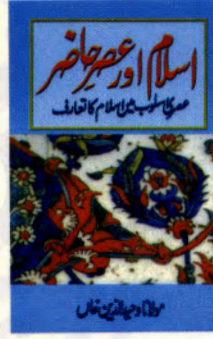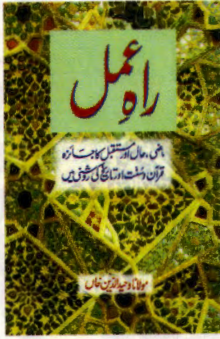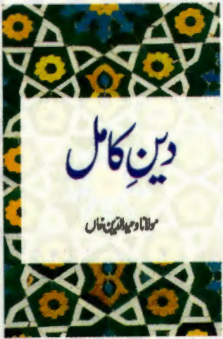
ISLAMIC STUDIES

GOODWORD

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-81-7898-867-2

9 788178 988672

₹ 50